بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجددینِ سلسلۂ قادریہ

مصنّف
سیّد محمود الحسن گیلانی
قبولہ۔ ضلع ساہیوال

سیّد سنز پرنٹرز
۴۰۔ اردو بازار۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	————	مجددین سلسلہ قادریہ
مصنف	————	سید محمود الحسن گیلانی
ناشر	————	سید مقصود احمدؒ سید افتخار احمد
مطبع	————	سید سنز پرنٹرز 40 اردو بازار لاہور
کمپوزنگ	————	سید سنز
تعداد	————	کتب
قیمت	————	اسی روپے
سال اشاعت	————	جنوری 1999ء

ملنے کا پتہ:

1۔ مکتبہ درویش 54 عبدالکریم روڈ لاہور

2۔ بیکن بکس، گلگشت ملتان

3۔ مکتبہ غوثیہ شاہ علیؒ احمد روڈ ڈیرہ غازی خان

فہرست

انتساب

سید مقبول محی الدین گیلانی کے نام
کہ جن کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف اول

ھوالقادر

جسٹس سید شمیم حسین قادری، سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ پنجاب پاکستان۔
میرے محترم سید محمود کی گراں قدر تصنیف میری نظر سے گزری ہے آپ نے جس جانفشانی سے اسلاف مشائخ سلاطین کے حالات کی تصویر کھینچی ہے یہ مرحوم کی علم و فضیلت و تحقیق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
سلسلہ عالیہ قادریہ کیتھل کی داستان معرکۃ العرا اور ایک ایک درویش کا دل خواہ حضرت شاہ سکندرؒ ہوں یا اعلیٰ حضرت شاہ کمالؒ دین و دنیا دونوں کے بادشاہ تھے اور حضرت سرھندی مجدد الف ثانی کی شان جس طرح آپ نے دربار اکبری اور جہانگیری میں بیان کی ہے یہ سید محمود کی علمی عظمت اور روحانی کیفیات کی نشاندھی کرتی ہے۔
آپ میرے بچپن سے ہی مجھ پر شفقت فرماتے اور شعر و سخن کی محفلیں ان کی صدارت میں بٹالہ میں قائم ہوتی رہیں اور مجھے اس روز کا اشتیاق رہتا۔ آپ منکسر المزاج نفیس انسان تھے اور علم و فضل کے بے بہا خزانوں سے مالا مال تھے۔ کاش انہیں موقع ملتا کہ وہ اور بھی اپنے قلم سے کام لیتے۔ بہر کیف یہ تصنیف میرے نزدیک لعل و جواہر کا مرقع ہے۔ جو ان کا فیض جاریہ رہے گا اور بندگان خدا اس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(دستخط)

سید شمیم حسین قادری

حرف گفتنی

آج جب میں یہ سطور سپرد قلم کر رہا ہوں سید محمود الحسن گیلانی مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن وہ مجددین سلسلہ قادریہ کے نام سے ایک ایسا تذکرہ اپنی قلمی یادگار چھوڑ گئے ہیں جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ یہ تذکرہ میرے پیش نظر ہے اور سطر سطر سے مرحوم کی شخصیت کے خدوخال عکس باریاں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایسا قلبی اور قلمی کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ ہم ان کے گہرے نقوش سدا اپنے دلوں میں فروزاں پائیں گے۔ ان نفوس کا تذکرہ لکھنا جو پس حجاب جا چکے ہیں اور خصوصاان مقدس شخصیات کی تزکار نویسی جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عقیدت و ارادت کا مرکز و محور ہیں آسان کام نہیں ہے اس لئے بقول مصنف:

"گزرے ہوئے زمانے کی صیح تصویر کھنچنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے ہوا کو مٹھی میں پکڑنا یا شعاع آفتاب کو مقید کرنا"

اس سے بھی بڑی دشواری بقول سید محمود الحسن گیلانی مرحوم یہ ہے کہ:

"جس ہستی سے ہمیں انس و عقیدت ہوتی ہے ہم اس کے گرد الوہیت مافوق البشریت اور غیر معمولی حالات کا ایسا تانا بانا بن دیتے ہیں کہ اس کی سیرت کے صیح خدوخال عقیدت مندی کے اس انبار میں بوجھل ہو کر رہ جاتے ہیں اور ہم تک اس بزرگ کے صیح کارنامے نہیں پہنچ سکتے"

دین اسلام کی اشاعت تعلیمات قرآنی کی تبلیغ اور شریعت محمدی ﷺ کی تعلیم و تفہیم کے ساتھ ساتھ فرد کی تشکیل سیرت اور انسانی معاشروں کی تزئین و تہذیب میں خاصان خدا اور اولیائے الٰہی کا بڑا دخل اور بہت حصہ ہے۔ نبوت جب اپنا فریضہ ادا کر چکی تو اس نے صحابہ کرام کی ایک جماعت چھوڑی جس کے فکر و نظر اور سیر و اعمال انوار نبوت سے منور تھے۔ اس مقدس و مطہر جماعت نے دین و اخلاق کی توسیع و اشاعت کا کام کیا۔ پھر اس جماعت کے نور سے سینہ تاب ایک گروہ تابعین صلحائے امت اور

مسترد کرتے رہے ہیں ان کو جنگوں کی غارت گریوں اور ہلاکتوں کو روکتے اور انہیں امن و عدل کی جانب راہ نمائی کرتے رہے ہیں۔ غلط رسوم کو سیلاب بلا اور غلط عقائد و نظریات کی باد صرصر کے سامنے بند شیں قائم کرتے رہے ہیں الغرض ہر طوفان' جبر طغیان' ہوس اور ہر ابتلائے گمراہی کے مقابل ان کا وجود مسعود پیش بندی کرتا رہا ہے۔ اسی آئینے میں ان کی شخصیت و عمل کا چہرہ دیکھنا چاہیئے۔ یہی سیرت ان کی کرامت ہے۔ وہ کرامتیں جو خوارق عادات کہلاتی ہیں وہ اولیا کے لئے اسی طرح وجہ افتخار اور دلیل ولایت نہیں ہیں جس طرح انبیاء کرام کے لئے معجزات وجہ افتخار اور دلیل نبوت نہیں ہیں ۔ اس کے باوجود کفرو باطل کو "عاجز" کرنے کے لئے کبھی کبھار معجزہ نمائی کی ضرورت پیش آئی ہے بعینہ اسی طرح کبھی کبھار صدور کرامت بھی ضرور ہو جاتا ہے لیکن وہ دلیل ولایت نہیں بن سکتا ۔ مراد یہ ہے بعض کرامت واقعی عمل میں آئی ہیں اور درست ہیں لیکن ولایت کے اصلی چہرے پر انہیں نقاب و حجاب نہیں بننا چاہیے ۔

سید محمود الحسن گیلانی مرحوم نے (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) اسی اصول اور اسی نقطہ نظر کی بنیاد پر یہ تذکرہ لکھا ہے ۔ اس اعتبار سے یہ ایک منفرد ممتاز اور سب سے الگ تھلک ایک ایسی وقیع کوشش ہے جو قابل فخر بھی ہے اور لائق اطمینان بھی کہ اس آئینے میں اولیائے کرام کے حسین و جمیل چہرے پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔

فاضل مصنف نے اس تذکرے کو محض صوفیانہ مذاق ہی میں نہیں لکھا ہے بلکہ دین' علم تہذیب اور ادب کی کئی سطحیں سامنے رکھی ہیں تاریخی چھان بین اور تحقیق کی چھلنی کا عمل برابر قائم رکھا ہے ۔ نہایت حزم و احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے اور استقصا کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی بات مشتبہ لگی' یا اس میں ذرا بھی کھٹک محسوس ہوئی اور اس کی تحقیق کی سند ہاتھ نہ لگ سکی' اسے شامل ذکر نہیں گیا اسی طرح جس شخصیت کا ذکر کیا گیا۔ ہے' اس کے دور کے تمام دینی' اخلاقی' معاشرتی' سیاسی' تاریخی' جغرافیائی اور نفسیاتی عوامل و عناصر کے پس منظر پر نظر رکھی ہے تمام احوال و کوائف کا بھرپور

تجزیہ اور ان پر کڑی تنقید کی ہے پھر اس تمام دھند اور غبار سے کسی مرد حق آگاہ اور ولئی حق گو کا چہرہ نکھارا ہے۔ اس طرح یہ تذکرہ محض کتاب تصوف نہیں رہا بلکہ بے شمار علوم و معارف اور تواریخ و احوال کا آئینہ بن گیا ہے۔

ایک زبردست فیکٹراور ایک جزو اعظم جو اس تصنیف کا طغرائے امتیاز ہے وہ مصنف کا ادیبانہ اسلوب بہت سجا ہوا بہت اجلا اور شفاف' بہت دلنشین و دل آویز ہے۔ اس میں علمی زیبائش بھی ہے اور ادبی محاسن کی آرائش بھی اتنا ضخیم تذکرہ جو اپنے اندر بے شمار صوفیانہ اور کئی مسائل و موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس ادیبانہ حسن کے ساتھ ترتیب و تحریر میں لانا مصنف کی فنی ریاضت' علمی صداقت اور ادبی بصیرت کی دلیلِ روشن ہے۔ مجددین سلسلہ قادریہ کا یہ حسین و عظیم تذکرہ ایک ایسا چمن ہے جس میں پھول تو بے شمار ہیں کانٹا ایک بھی نہیں۔

خاکپائے اولیاء
عاصی کرنالی

اعتذارِ مصنف

گزرے ہوئے زمانہ کی صحیح تصویر کھینچنا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسے ہوا کو مٹھی میں پکڑنا یا شعاعِ آفتاب کو مقید کرنا۔ ہم کتنا ہی تصور کا سہارا لیں اور جس طرح چاہیں تصورات کی دنیا بسائیں ممکن نہیں کہ عہد ماضی کو قلم کی زنجیر سے مقید کر سکیں۔ جو کچھ ہم تاریخوں میں دیکھتے اور کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کسی شاہراہ پر سے دیر ہوئی کوئی کارواں گزر چکا اور فقط غبار کارواں باقی رہ گیا ہے۔ یا دور سے آوازِ جرس ہوا کے دوش پر سوار ہو کر ہم تک پہنچ جائے۔ اور ہم اس سے قافلہ کے صحیح مقام کے تعین کرنے کی کوشش کریں۔ یا محض نقشِ پا کو دیکھ کر اس مقام سے گزرنے والے شہسواروں کی عظمت کا اندازہ لگائیں۔ انسانی فطرت کا ایک یہ بھی قاعدہ ہے کہ گزشتہ زمانہ کے حالات کو وہ موجودہ زمانہ کی کیفیت سے مطابقت کیا کرتی ہے۔ بیتی ہوئی صدیوں پر جو تہ بہ تہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ انھیں اٹھا دینا کچھ ایسا آسان کام نہیں۔ اور جب ہم اس قسم کی کوشش کرتے ہیں بہت سی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ سیرت نگاری کے سلسلہ میں تو اس قسم کی کوتاہیاں عام نظر آتی ہیں کہ جس ہستی سے ہمیں انس یا عقیدت ہوتی ہے۔ ہم اس کے گرد الوہیت، مافوق البشریت اور غیر معمولی حالات کا ایسا تانا بانا بن دیتے ہیں۔ کہ اس کی سیرۃ کے صحیح خدوخال عقیدتمندی ~~عقیدتمندی~~ کے اس انبار میں اوجھل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور ہم تک اس بزرگ کے صحیح کارنامے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ کوتاہی بزرگان دین اور سلسلہ ہائے تصوف کے بانیوں اور رہنماؤں کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر نظر آتی ہے۔ ژرف نگاہی اور تجسس سے اگر کام لیا جائے، تو صاف نظر آتا ہے کہ ژرف نگاہی کے متعلق تمام لغزشوں اور غلطیوں کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے عربوں کے علمی تسلط کا دور ختم ہونے کے بعد اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ در آنحالیکہ قرن اول کے محققوں اور نکتہ آفرینوں نے تاریخ اور سیرۃ کے فن کو وہ عظمت عطا کی تھی۔ کہ دنیا میں اس کی مثال ناپید ہے۔ وہ

قوم کی علمی تحقیق و تجسس کے میدان میں جس کا کوئی حریف نہ تھا جب ہم اس کے اولین ذخیرہ علمی کو دیکھتے ہیں اور بعد کے مصنفین کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو حیرت ہوتی ہے۔ کہ کیا یہ مورخین اور سیرۃ نگار انہی لوگوں کے جانشین اور انہی کے علوم و فضائل کے خوشہ چین ہیں جنہوں نے احادیث ' روایت و درایت ' اور اسماء الرجال کا وہ بیش بہا ذخیرہ دنیائے علم کو عطا کیا۔ کہ آج تک اس کا جواب پیدا نہ ہو سکا اور جس قوم نے ابن خلدون ' ابن اثیر اور ابو الفر جیسے مورخ پیدا کئے۔ ان کے اخلاف ذہنی اعتبار سے اس درجہ کمتر ہیں کہ اسلاف کی بلند خیالی کا ذرا بھی پر تو ان کی تحریروں میں نظر نہیں آتا۔ میرے قیاس کے مطابق اس کی وجہ اور اس کا سبب محض ایک ہی ہو سکتا ہے کہ جب تک مسلمان مسند عروج پر فائق رہے تب تک علوم و فنون کی دنیا میں بھی ان کی بلندی اور برتری قائم تھی اور جب ان کے اقبال کا آفتاب گہنانے لگا۔ تو دنیائے علم و فنون پر بھی اندھیرا چھا گیا اور وہی کچھ ہونے لگا جو رات کے اندھیرے میں بھٹکے ہوئے قافلوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہ شاہراہ کو چھوڑ کر بے مقصدو بے مدعا صحرائے ناپیدا کنار میں پھرنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی قوم اپنے عروج کی انتہائی بلندیوں پر ہوتی ہے تو اس کے تمام کارناموں میں اس کی بلندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور جب اسی قوم کی مسند اقبال کو زمانہ' تہ کر دیتا ہے تو اس کی دنیا کا ہر ہر گوشہ ابتذال کی ظلمتوں میں اسیر ہو کر رہ جاتا ہے چنانچہ جب عجمی اور ترک قوموں پر سے عربوں کا تسلط کم ہوا۔ اور عالم اسلام کی رہنمائی کرنے والی اس قوم کے ہاتھوں سے قدرت نے عنان اقتدار و اختیار چھین لی۔ تو پھر پریشان خیالی ' اور ذہنی پستی کا ایک سیلاب امنڈ آیا اور اسی کو ان لوگوں نے اپنا مطمع نظر قرار دے لیا۔ سوانح و سیرۃ کے سلسلہ میں یہ کیفیت زیادہ شدید ہے۔

بزرگوں کے جتنے بھی تذکرے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ملتے ہیں۔ ان میں سوائے کرامتوں کے اور کوئی ذکر نظر نہیں آتا۔ ان نفوس قدسی نے اپنے دور پر کیا اثرات مرتب کئے۔ اور وہ جن حالات میں عمل پیرا ہوئے وہ کس طرح تھے۔ زمانہ کی سازگاری و نا

سازگاری سے انہوں نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ غرضیکہ ان تذکروں سے کسی قسم کی رہنمائی میسر نہیں آتی۔ میں نے جب حضرت شاہ کمال قادریؒ اور حضرت شاہ سکندر قادریؒ کی سوانح حیات لکھنے کا ارادہ کیا تو مجھے اس راہ میں سب سے اول یہی دشواری پیش آئی کہ جو مقصد میرے مد نظر تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے کوئی مواد مہیا نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال مختلف تذکروں کی امداد اعانت قیاس و تصور تخیل کی رہنمائی میں تاریخی واقعات کی شہادت سے حسب مقدور اس تذکرہ کو مکمل کیا ہے۔ سب سے اول حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ میراں محی الدین کی حیات طیبہ کے وہ حالات ہیں کہ جس کے ذریعے سے انہوں نے اپنے دور کو ایک نئے رخ پر ڈھالا تھا کتاب کے دوسرے حصے میں خدا کرے میری یہ سعی جو ایک طرح کی جسارت سے کم نہیں (چونکہ قدیم روش کو ترک کر کے تذکرہ نویسی کی انجانی وادیوں میں قدم رکھا ہے) اہل نظر کے نزدیک مقبول ہو اور میری یہ ادنی سی سعی آئندہ کے لیے راہ عمل کشادہ کرنے کا باعث ہو

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را غم بہار بادا

خاکسار مصنف
سید محمود الحسن کیتھلی
قبولہ۔ ضلع ساہیوال

سید ابوالحسن علی مد ظلہ کی دعوت و عزیمت، شیخ اکرام الحق کی آب کوثر موج کوثر اور رود کوثر کے انداز تحریر نے میری قلم کی روانی اور ذہن کو تابانی عطا کی۔

زبدۃ المقامات نے اس تذکرہ کی تالیف میں میری رہنمائی کی اور سب سے زیادہ حصہ اس تصنیف کی ترتیب سید مقبول محی الدین سلمہ کی سعی و کوشش کا ہے۔ کہ انہی کی توجہ سے طلعطلین ثمرا یہ تصنیف اشاعت پزیر ہو سکی۔ جزاک اللہ فی الدارین خیرا

حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ

چوتھی صدی ہجری اسلامی تاریخ کا تاریک ترین باب ہے عربوں کے اقبال کا وہ آفتاب جس نے صدیوں تک دنیا کو روشن کئے رکھا شام زوال کے سایوں میں روپوش ہو چکا تھا ۔ عباسی خلافت کا جلال جس کے نام کی ہیبت سے کبھی شہنشاہوں کے تخت و تاج لرزتے تھے ۔ اس زمانہ میں اس کی وقعت کسی درگاہ کی سجادہ نشینی سے زیادہ نہ تھی مرکزی حکومت کا وقار ختم ہو چکا تھا ۔ طالع آزما اور مہم جو نبرد آزماؤں نے جا بجا اپنی آزاد حکومتیں قائم کر لی تھیں ۔ عالم اسلام اور ملت اسلامیہ کا وہ سر رشتہ اتحاد ٹوٹ چکا تھا ۔ کہ جس میں شش جہت عالم بندھے ہوئے تھے درگاہ اقتدار کے ٹھکرائے ہوئے اور دنیائے سیاست سے دھتکارے ہوئے لوگوں نے نئے نئے رنگوں میں ظہور کیا تھا ۔ خاندانی آویزش، قبائلی عصبیت جو آج تک ایک مضبوط مرکز کے تحت دبی ہوئی تھی ۔ اس نے پھر سے برگ و بار نکالنے شروع کر دیئے تھے ۔ عجم کی خانہ بر انداز فطرت کی ریشہ دوانیاں پوری قوت کے ساتھ مصروف تخریب تھیں ۔ ان قوتوں کی ہنگامہ آرائی نہ صرف یہ کہ عربی اقتدار کے لیے زہر قاتل تھی بلکہ خود اسلام کے بنیادی عقائد اور شعائر اسلام کے لیے بھی شدت سے نقصان رساں تھی ۔ حکومت اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر مہم جو آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا سہارا تلاش کرتا اور ان کے ناقابل تبدیل الفاظ میں حسب ضرورت تاویل و تبدیلی سے کام لیتا تھا چنانچہ ایسے کئی منتشق گروہ پیدا ہو چکے تھے جنہوں نے اسلام و قرآن پاک کی تفسیر عجیب و غریب انداز میں کی اور یہاں تک کہ حسب ضرورت ایک نیا اسلامی ڈھانچہ تیار کر لیا ۔ جسے عجائب پسند طبائع نے بلا چون و چرا قبول کر لیا ۔ اور جب حکومت و اقتدار ان طالع آزماؤں کے ہاتھ میں آئے تو انہوں نے عالم اسلام اور مسلمانوں سے ایسا شدید انتقام لیا کہ خود روح انسانیت لرز اٹھی چنانچہ قرامطہ کا وہ رسوائے عالم طبقہ کہ جو مدتوں تک عالم اسلام کے چہرہ زیبا کے لیے بدنما داغ بنا ۔ اسی زمانہ میں برسر اقتدار آیا ۔

قرامطہ

عبیدین مصر اور قرامطہ کا ظہور ایک ہی زمانہ میں ہوا۔ دونوں گروہ اسماعیلی شیعہ تھے۔ 278ہجری میں ایک شخص عیسیٰ بن فرج مضافات کوفہ میں نمودار ہوا۔ وہ اپنے آپ کو قرامطہ کے نام سے موسوم کرتا تھا زاہد و عابد تھا اپنے آپ کو مسیح موعود کا ایلچی کہتا تھا۔ مسیح موعود کے عقیدہ نے کچھ ایسی بری ساعت میں عالم اسلام میں قدم رکھا تھا۔ کہ اس عقیدہ کے بل پر داعیان اقتدار نے ہر دور میں عالم اسلام کے سینہ میں خنجر زنی کی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے بھی لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے حامیوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر لی۔ قرامطہ کا مستقر بحرین تھا جیس اس طبقہ کے بانی نے ایک شہر احساء کے نام سے آباد کیا۔ اس خاندان میں ایک شخص ابو طاہر بڑی قوت اور اقتدار کا مالک ہوا۔ اس نے 287ء ہجری میں بر سر اقتدار آتے ہی قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ خلیفہ بغداد اس کے مقابلہ میں قطعی بے بس تھا۔ اس شخص نے مکہ پر چڑھائی کی۔ حجرا سود اکھاڑ لیا۔ اور اپنے ساتھ بحرین لے گیا۔ یہ نا ہنجار حرکت کہ جس نے دنیائے اسلام میں تہلکہ برپا کر دیا 317ء ہجری میں عمل میں آئی اور حجرا سود 22 سال تک مکہ معظمہ سے باہر رہا۔ یہ خاندان 375ء تک حکومت کر کے اپنی شقاوت و بدبختی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

فرقہ باطنیہ

زوال قرامطہ کے معا بعد فرقہ باطنیہ نے اپنی رسوائے عالم سرگرمیاں شروع کر دیں۔ لوگ ابھی اسلام پر لگائے گئے قرامطہ کے زخم نہ بھولے تھے کہ اس نئے گروہ نے جو عقائد و اعمال اور مسلمانوں اور عالم اسلام کی بیخ کنی میں فرقہ قرامطہ سے کسی طرح کم نہ تھا مسلمانوں میں ہیجان بپا کر دیا۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے خلافت بغداد ہر

فتنہ کے سامنے بے بس اور ہر نئی قوت کے آگے سرنگوں تھی اس لیے اس سیلاب بلا کو روکنے میں بھی ناکام رہی ۔ اسی فرقہ کا بانی حسن بن صباح ایک یگانہ روزگار شخصیت تھا ۔ اگر اس شخص کی قوت کارکردگی تخریب میں صرف نہ ہوتی تو بلاشبہ اسے رہنمایان اسلام کے ناموروں میں سر فہرست جگہ ملتی ۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی اور اس کے جانشینوں کی زندگیاں ایسی سرگرمیوں میں گزریں کہ جنہیں [عالم] اسلام میں پسندیدگی سے نہیں دیکھا گیا ۔ اس فرقہ کے عقائد و اعمال سے قطع نظر ان کے دامن پر صلحائے امت ' علماء و متصوفین کے خون کے وہ داغ ہیں کہ جن کی بد نمائی قیامت تک دور نہیں ہو سکتی ۔ اس زمانہ میں ہر مسلمان باطنیوں کی خنجر آزمائی کا شکار تھا اور نامور ہستیاں تو بالخصوص ان کا ہدف تھیں اس گروہ کا بانی 90 سال کی عمر پا کر 518 میں فوت ہوا اور قلعہ الشموت کی صورت میں اپنے جانشینوں کے لیے ایک مضبوط مستقر چھوڑ گیا اور دینی اور دنیاوی امور میں بلا چون و چرا اپنے امام کے احکام چاہے وہ جائز ہوں یا ناجائز ماننے والا ایک عظیم گروہ پیدا کر گیا ۔

یہ فتنے تو جنکا اوپر ذکر ہوا عین خلافت بغداد کے زیر سایہ فروغ پا رہے تھے ۔ شمال مغربی افریقہ میں ایک اور قوت نے اپنے پاؤں جما لئے تھے جس نے دولت عبیدیہ کے نام سے دنیا میں شہرت پائی ۔ ہرچند کہ اس سلطنت کے بانیوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر بعض مفید اور عظیم الشان کارنامے سر انجام دیئے ۔ لیکن اس کے حکمران اور اراکین سلطنت کی مجموعی کوششیں ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں صرف ہوتی رہیں ۔ یہ تمام گروہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی مرکزی حکومت کے ضعیف کرنے کے درپے رہے اور اس کی ظاہری شان و شوکت کو کم کرنے میں کوشاں رہے بلکہ انہوں نے مذہب کے نام پر اعمال و عقائد کا ایسا مجموعہ اپنے پیرو کاروں کے لیے چھوڑا کہ جس نے ابدالاباد تک کے لیے ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ۔ ان لوگوں نے جو لائحہ کار اپنے معتقدین کے لیے تجویز کیا تھا ۔ اگرچہ اسے قرآن و سنت سے ماخوذ بتایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام ڈھانچہ

جو تیار کیا گیا تھا ۔ فقط اپنی سلطنت کی بقاء و استحکام کی تدبیریں تھیں کہ بعد میں جنہوں نے ایک مستقل مذاہب کی صورت اختیار کر لی ۔ اور جس نے عالم اسلام کی ہیت اجتماعیہ کو شدید نقصان پہنچا ۔ وہ دن تو رخصت ہو چکے تھے کہ جب مسلمان شہسواروں کی یلغاروں سے یہ کرہ ارض کانپتا تھا ۔ اب تو یہ ایک دوسرے سے ہی دست بگریباں تھے ۔

ان فرقوں اور مذاہب سے قطع نظر کہ جنہوں نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے قرآن و حدیث کی من مانی تاویلیں کیں اور نئے مذاہب کی بنیادیں رکھیں ۔ خود مسلمانوں میں ایسی گروہ بندیاں نمودار ہو چکی تھیں ۔ کہ جو بجائے مفید ہونے کے سراسر نقصان رساں تھیں ۔ وہ بزرگ کہ جنہوں نے قوانین شریعت کی تدوین میں اپنی عمریں گزاری تھیں ۔ اور جن کی تمام زندگیاں تحقیق و تجسس کی منزل میں بادیہ پیمائی کرتے گزری تھیں ' اور جن میں بعض نے ترویج شریعت اور مذہب کی حفاظت میں شدید صعوبتیں برداشت کی تھیں ۔ ان کے نام پر مسلمان ایک دوسرے سے الجھتے اور نہ صرف یہ کہ الجھتے اور معرکہ آرائیاں کرتے بلکہ ایک دوسرے کے خلاف شمشیر و سناں استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے ۔ یہ اہل اسلام کا عالم تھا ۔ جو صوفیا حق پرست تھے ۔ وہ حق سے روگرداں تھے ۔ امراء مال و دولت سمیٹنے میں مصروف اور ارکان سلطنت سیاسی ریشہ دوانیوں میں محو تھے ۔ گویا تمام عالم اسلام مرکز ثقل سے دور اور اس وقت اپنے فرائض دینوی اور دنیوی سے غافل تھا ۔ ایسے عالم میں ان قوتوں نے سر ابھارا کہ ماضی میں جنہیں اسلامی مقبوضات کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی ۔ وہ عیسائی حکمران کہ جو غازیان اسلام کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک نہ بھولے تھے ۔ اب اس قابل ہوئے تھے کہ میدان خالی اور مسلمانوں کو اپنے وظیفہ حیات سے غافل پا کر ان مقدس سرزمینوں پر قدم رکھنے کی جرات کریں ۔ کہ جن کے ذرہ ذرہ کی آبیاری غازیان اسلام نے اپنے خون سے کی تھی ۔ سرزمین فلسطین وہ ارض مقدس تھی کہ جو یہودیوں ' عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر تقدیس کی حامل اور لائق تعظیم

تھی ۔ جب تک پیروان اسلام کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن پاک رہے ۔ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی ۔ کہ ارض فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کریں ۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا ۔ وہ غازی جن کی شمشیر خارا شگاف کی ہیبت سے روح عالم لرزتی تھی ۔ دنیا ان سے خالی ہو چکی تھی ۔ چنانچہ 490ھ میں عیسائیوں نے سرزمین قدس پر تاخت و تاراج شروع کر دی ۔ اور وہ مقامات جہاں امن و امان کے گلستان عطر بیز تھے ۔ وہاں آگ اور خون کی بارش برسنے لگی ۔ اور آخر 492ھ میں وہ خونیں حادثہ بھی چشم فلک نے دیکھا ۔ کہ بیت المقدس مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوگیا ۔ اور عیسائیوں نے اس مقدس شہر پر قبضہ کر لیا ۔ جو مسلمانوں کی آنکھ کا تارا تھا ۔ کیسا عبرت ناک منظر تھا ۔ کہ جو فاتح تھے وہ مفتوح بن گئے تھے ۔ اور جو تمام دنیا کو امن و امان مہیا کرنے والے تھے ۔ آج عیسائیوں کی تلواروں سے انہیں کوئی نجات دلوانے والا نہ تھا ۔ اور وہ سرزمین جہاں مسلمانوں کی قوت تعمیر اور حسن تدبیر نے حسین و دلپذیر مناظر پیدا کیے تھے ۔ آج ان کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی ۔ اس مقدس سرزمین پر جو گزری سو گزری ۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ عالم اسلام پر اتنا بڑا حادثہ گزر گیا ۔ اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی ۔ مسلمان بدستور خواب غفلت میں مدہوش رہے ۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ○

گویا تخریب کا جو سلسلہ چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں شروع ہوا تھا۔ وہ پانچویں صدی کے آخیر میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اور وہ فرمان خداوندی پورا ہوا۔ کہ اگر تم اپنے ورثے کی حفاظت نہ کرو گے۔ تو وہ کسی اور کے سپرد کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ قانونِ قدرت ہے۔ کہ ہر تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور یہ قانون تاریخ اسلام میں بالخصوص کارفرما نظر آتا ہے۔ جب بھی مسلمانوں کی پستی اور زوال اپنی انتہا کو پہنچا اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی شخصیت کو پیدا کر دیا۔ جو سفینۂ اسلام کے لئے کارِ ناخدائی کر گئی۔ چنانچہ یہ دور جس کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا مسلمانوں کے لئے انتہائی اِبتلاء و آزمائش کا دور تھا۔ لیکن اس کے ساتھ رحمتِ خداوندی جوش میں آئی۔ اور عین عالم خزاں میں نسیم بہار کے جھونکے خانہ خرابوں کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرنے لگے۔

ملک ایران کے شمال میں کوہ البرز کے نام سے جو پہاڑی سلسلہ موسوم ہے۔ اس کے دامن میں ایک صوبہ گیلان کے نام سے موسوم ہے۔ یوں تو یہ تمام ملک ہی قدرت کے انعامات سے سرفراز اور حسن و رعنائی کی تصویر ہے۔ لیکن یہ صوبہ تو مشاطہ فطرت کے کمالات کا شاہکار ہے۔ اس صوبہ کے قصبہ گیلان میں حسنیؓ خاندان کا ایک گھرانہ آباد تھا۔ کہ جو علم و فضل اور زہد و ورع کے لحاظ سے اقران و اماثل میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس گھرانے کے سربراہ جناب ابو صالح ابو محمد الجیلی تھے۔ کہ انہی کے گھر سے ۱۷ ہجری میں وہ بدر کامل طلوع ہوا۔ کہ جس کے نور نے عالم اسلام کے در و دیوار کو فروغ آفتاب عطا کیا۔ ان دنوں خلافت عباسیہ کے تخت پر ستائیسواں خلیفہ مقتدی باللہ متمکن تھا۔ والد بزرگوار نے آپؒ کا نام عبدالقادرؒ رکھا جو بلاشبہ آگے چل کر عبدہ ثابت ہوا۔ آپؒ کی والدہ محترمہ حسینی سادات میں سے تھیں۔ اس طرح گویا آپؒ کی ذات مجمع الانوار تھی۔ جس دور میں آپؒ پیدا ہوئے۔ یہ دور اسلام اور مسلمانوں کے لئے غایت درجہ پر آشوب تھا۔ جیسا کہ صفحات ماسبق میں بتایا جا چکا ہے۔ ایک طرف اندرونی شورشیں تھیں جو مذہبی اور سیاسی دونوں میدانوں میں اسلام کی بیخ کنی پر کمربستہ تھیں۔ دوسری طرف بیرونی طاقتیں تھیں۔ جو ملت اسلامیہ

کے ہاتھوں سے عنان اقتدار چھین لینے پر کمر بستہ تھیں۔ دولت غزنویہ و سلاجقہ کے اقبال کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ملک شاہ سلجوقی ۴۸۵ھ میں فوت ہوا۔ اور اس با اقبال بادشاہ کے مرتے ہی دولت سلجوقیہ کی سطوت خانہ جنگی کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ اس سلطنت کے ختم ہوتے ہی عیسائیوں نے بلاد اسلامیہ پر تاخت و تاراج شروع کر دی۔ گویا جس وقت آپؒ نے اس عالم کون و مکاں میں قدم رکھا۔ سرزمین اسلام اندرونی اور بیرونی زلزلوں سے لرزہ بہ اندام تھی۔ لیکن قدرت نے حسنی خاندان کے اس چشم و چراغ سے احیائے دین اور تجدید ملت کا کام لینا تھا۔ اسی لئے عالم طفلی میں ہی آپؒ کی ذات سے وہ علامات ظاہر ہونے لگیں۔ جو بلند مرتبہ ہستیوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ بچپن میں آپؒ بتقاضائے طفولیت کھیل کود میں مشغول تھے۔ کہ غیب سے ایک آواز آئی "عبد القادر تو اس کام کے لیے نہیں بنا ہے"۔ اس نوائے سروش سے متنبہ ہو کر آپؒ پہلے سے بھی زیادہ حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ ابھی آپؒ نے پوری طرح ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ پدر بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ گویا قدرت کو یہ دکھانا مقصود تھا۔ کہ دنیا میں ہم جس کے سپرد کوئی بڑا کام کیا کرتے ہیں۔ تو اسے دنیوی سہاروں سے بے نیاز کر دیا کرتے ہیں۔ اب آپؒ کی تربیت و پرورش کا تمامتر بار آپؒ کی والدہ ماجدہ کے ضعیف و ناتواں شانوں پر آپڑا۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ اس اولوالعزم خاتون نے اپنے اس فرض کو غایت درجہ حسن و خوبی سے ادا کیا۔

اٹھارہ سال کی عمر تک آپؒ اپنے وطن اور اس کے نواح کے علما و فضلا ہی سے اکتساب علوم فیوض کرتے رہے۔ جب یہاں کے چشمہ ہائے فیض سے پوری طرح سیراب ہو گئے۔ تو آپؒ نے اس دور کے بلند ہمت طالبان علم کی طرح بغداد کا رخ کیا۔ کیونکہ بغداد اس زمانہ میں شاندار مدارس اور یگانہ روزگار اساتذہ کا گہوارہ تھا۔ دنیا میں جسے اس چشمہ آبحیات کی جستجو ہوتی تھی۔ وہ بغداد ہی کا رخ کرتا تھا۔ والدہ محترمہ سے اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ بوقت رخصت والدہ ماجدہ نے دیگر پند و نصائح کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ حق گوئی و بے باکی کی تاکید فرمائی۔

حق گوئی و بیباکی آئین جواں مرداں　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور زبان مبارک سے فرمایا۔ "اے میرے نور چشم! تمہارے سر پر چاہے کیسی ہی مصیب
ٹوٹ پڑے۔ جھوٹ ہرگز نہ بولنا۔ اور یہ لو چالیس اشرفیاں۔ یہ تمہارے تعلیمی اخراجات کے
ہیں"۔

چنانچہ آپؒ والدہ محترمہ کی دعاؤں اور پند و نصائح کے سرمایہ کے ساتھ ایک کارواں کے ہم
عازم بغداد ہوئے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے۔ وہ زمانہ انتہائی پر آشوب تھا۔ مرکزی اور صوبا
حکومتوں کا انتظامی ڈھانچہ کمزور ہو چکا تھا۔ اور امن و امان مفقود تھا۔ راہزنوں اور ڈاکوؤں کا دو
دورہ تھا۔ راہگیر روز روشن میں لٹ جاتے اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ابھی یہ کارواں چند منازل ہی
طے کر پایا تھا۔ کہ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کر دیا۔ معمولی مقابلہ کے بعد کارواں والوں نے ہتھیا
ڈال دیے۔ اور ڈاکوؤں نے بے غل و غش مال و اسباب پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ یہ نوخیز سی
زادہ کہ جس کا سینہ مکارم اخلاق کا گنجینہ تھا۔ ایک گوشہ میں کھڑا اس غارتگری کو دیکھ رہا تھا۔ جب یہ
لوگ قافلہ کو پوری طرح لوٹ چکے تو ایک راہزن انؒ کی طرف بھی آیا اور پوچھا کہ "تیرے پاس
بھی کچھ ہے؟" انہوںؒ نے بیساختہ جواب دیا کہ "ہاں میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں"۔ ڈاکو کے
لئے یہ جواب غیر متوقع تھا۔ لیکن چونکہ آپ کے ظاہری احوال سے مطلقاً کسی قسم کا تمول ظاہر نہ
ہوتا تھا۔ اس نے اس جواب کو مذاق پر محمول کیا۔ اور کسی دوسرے شکار کی تلاش میں چل نکلا۔
چونکہ ایک ہنگامہ دار و گیر برپا تھا۔ اس لئے ایک ڈاکو جاتا تھا دوسرا آتا تھا۔ ابھی پہلا ڈاکو آگے
نکلا ہی تھا کہ دوسرے نے انؒ کے نزدیک آکر وہی سوال دہرایا۔ یہاں وہی ایک جواب تھا کہ "
ہاں میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں" ڈاکو کے لئے یہ جواب حیرت انگیز تھا۔ وہ حیران تھا کہ
لوگ تو اپنا مال و متاع ہر طور چھپانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ مگر یہ نوجوان واشگاف الفاظ میں
اپنے سرمایہ کا اعلان کر رہا ہے۔ اس نے مناسب سمجھا کہ وہ اس معاملہ کو اپنے سردار کے سامنے
پیش کرے۔ چنانچہ وہ آپؒ کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے سردار کے پاس پہنچا۔ اور اس کے سامنے

تمام ماجرا بیان کیا۔ سردار کے حکم سے جب آپؒ کی تلاشی لی گئی۔ تو آپؒ کا بیان حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔ شلوکے کی جیب سے چالیس اشرفیاں برآمد ہو گئیں۔ ڈاکوؤں کا سردار بڑا متعجب ہوا۔ اور اس نے آپؒ سے سوال کیا۔ "میاں صاحبزادے! تم اچھی طرح جانتے ہو گے کہ ہم ڈاکو ہیں۔ اور ہمارا پیشہ غارتگری ہے۔ لوگوں کا مال و اسباب لوٹنا ہمارا کام۔ لوگ ہم سے ڈرتے اور اپنا سرمایہ ہم سے چھپاتے ہیں۔ لیکن تم عجیب قسم کے انسان ہو کہ جب تم سے ہمارے آدمیوں نے دریافت کیا تو تم نے بلا تامل بتا دیا کہ میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں۔ یہ تو بتاؤ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟" آپؒ نے انتہائی متانت سے جواب دیا۔

" بلاشبہ آپ کی باتیں درست ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ لوگ مسافروں سے کیا سلوک کیا کرتے ہیں۔ لیکن میری والدہ محترمہ نے بوقت رخصت مجھے سچ بولنے کی ہدایت کی تھی۔ لہٰذا میرے لیے کسی امر واقعہ کو چھپانے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔"

ڈاکوؤں کا سردار آپؒ کے اس جواب پر عش عش کر اٹھا۔ اور عالم تحیر میں چلایا۔ "اے وائے! ایک یہ کمسن نوجوان ہے جو اپنی ماں کی ہدایت پر یوں عمل پیرا ہے کہ لٹ جانے کا غم نہیں رکھتا۔ اور کسی عالم میں بھی سچ بولنے سے گریز نہیں کرتا۔ ایک میں بد نصیب ہوں۔ کہ اک عمر گذر گئی۔ اور ایک دن بھی اپنے پروردگار کے احکام کی تعمیل نہیں کی۔" یہ واقعہ کسی ایسی مبارک ساعت میں پیش آیا۔ کہ سردار کی حالت متغیر ہو گئی۔ قبلہ رخ ہو کر بے اختیار زمین پر سر رکھ دیا۔ اور نیاز عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ جب آنسوؤں نے دل کا غبار دھو ڈالا۔ تو تمام ساتھیوں کو بلایا۔ خود بھی اس پیشہ سے تائب ہوا۔ اور ان سے بھی توبہ کرائی۔ قافلہ والوں کو جمع کیا۔ اور ان کا تمام مال و اسباب اک اک کر کے ان کے حوالے کر دیا۔

یوں پہلی مرتبہ اس حقیقت شناس معرفت نے عمل کے خلوص کی تاثیر دیکھی۔ اور عمر بھر کے لئے حق گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ بغداد پہنچ کر شیخ ابو سعید کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ یہ مدرسہ اس زمانہ میں مشہور عالم تھا۔ کہ یہاں ایک سے بڑا ایک فاضل روزگار عالم مسند درس آراستہ کیا کرتا تھا۔

شیخ ابو سعید المخزومی مسلکاً حنفی تھے۔ فقہ و حدیث کی تعلیم آپؒ نے انہی سے حاصل کی۔ جب آپ نے علم و فضل کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ طریقت و معرفت کے کوچہ میں قدم رکھا۔ تو اسی مدرسہ میں مسند درس آراستہ کی۔ اور شیخ ابو سعید المخزومی نے مدرسہ آپؒ کے حوالے کر دیا۔ تصوف اور سلوک کی تعلیم آپؒ نے شیخ حماد بن مسلم الرجبی الدباس سے حاصل کی اور انہی کے ہاتھوں آپ نے خرقہ خلافت پہنا۔ جو اس زمانہ کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ اور زہد و عبادت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آپؒ نے اس میں اتنا مقام حاصل کر لیا۔ کہ اس زمانہ کے باکمال آپؒ پر رشک کرنے لگے۔ یہ منزلیں طے کر لینے کے بعد آپؒ نے ان فرائض کی انجام دہی کا اہتمام کیا۔ جو قدرت نے اس زمانہ کی اصلاح۔ تادیب اور تعمیر کے لیے آپؒ کے ذمے لگائے تھے۔ شیخ ابو سعید مخزومی کا مدرسہ جو آپؒ کی تحویل میں تھا۔ چند ہی دنوں میں مرجع خلائق بن گیا۔ چونکہ آپؒ نے اس مدرسہ میں بیک وقت مسند درس اور مسند ارشاد کو زینت بخشی تھی۔ ہجوم خلائق کا یہ عالم ہوا کہ چند ہی دنوں میں مدرسہ کی توسیع کی ضرورت پیش آئی۔ ہر جمعہ اس مدرسہ میں آپؒ کا وعظ ہوا کرتا تھا۔ جس میں عوام کے علاوہ علماء و مشائخ وزراء و اراکین سلطنت شامل ہوا کرتے تھے۔ بلکہ روایت ہے کہ بعض اوقات خلیفہ وقت بھی بہ تبدیل لباس آپؒ کے مواعظ حسنہ سے مستفید ہوتا اور آپ کی مجالس میں شرکت کیا کرتا تھا۔

امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں نے حضرت غوث الاعظم کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے اور انہیں سادات مشائخ میں سے شمار کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ "مجموعۃ الرسائل الکبریٰ" جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ "شیخ عبدالقادر جیلانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بڑی سختی کے ساتھ پابند تھے۔ اور لوگوں کو بھی اس کی وصیت فرمایا کرتے تھے۔ ان کا سارا کلام اتباع امور، ترک محظور اور صبر علی المقدور کے نقطہ ہی کے اطراف میں گھومتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی۔ جو اس راستہ سے ذرا سی بھی ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہو" ۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ وہ دور مسلمانوں کا دور انحطاط تھا۔ عالم اسلام کے ہر گوشہ میں افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ علماء تھے تو ان کا

کام فقط علمی موشگافیوں تک محدود تھا۔ حکومت اور سلطنت عوام کی اصلاح احوال ان سب امور سے وہ لاتعلق تھے۔۔انہوں نے اپنے لیے ایک گوشہ عافیت تلاش کر لیا تھا۔ وہ تھی مسجد۔ کہ جہاں بیٹھ کر وہ تمام عالم اور احوال عالم سے مستغنی ہو جاتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ ان مساجد میں بیٹھ کر علمائے کرام مشاغل علمی سے شغف رکھتے۔ لیکن اس کے برعکس ان کے اکثر اوقات اپنے مخالفین اور معاندین کے خلاف فتویٰ نویسی اور تکفیر و تنقیص میں گذرتے تھے۔ اپنے مسلک کے خلاف جس کسی کی قلم یا زبان سے کوئی لفظ سن پاتے قلم کی تیغ و سناں سے مسلح ہو کر اس کے مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے شاگردوں اور مریدانِ باصفا کی فوج ظفر موج کی معیت میں وہ ہنگامہ کارزار گرم کرتے کہ سنجیدہ طبائع کے لیے اچھا خاصا سامان دل لگی فراہم ہو جاتا۔ ان کی اس " خدمت دین " سے جو ضعف اسلام اور مسلمانوں کو پہنچ رہا تھا۔ یہ سادہ دل مدعیان دین اس سے قطعی بے خبر اپنے شغل میں مشغول تھے۔ ان بزرگوں کی سعی لاحاصل نے مسلمانوں کو بیشمار گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جو اپنے ہادیان دین کی مانند اپنے مخالفین کے تشنۂ خون رہتے تھے۔ دوسری طرف صوفیائے کرام کا گروہ تھا۔ جو اپنے ان پیشرووں سے قطعی مختلف تھا۔ کہ جنہوں نے دین کے چشمہ صافی کو ہر آلائش سے پاک کیا تھا۔ اور زمانہ کی ناسازگاری نے اس میں جن خس و خاشاک کی آمیزش کر دی تھی۔ اسے دور کرنے میں ہر ابتلاء و مصیبت برداشت کی اور بلکہ بعض اوقات اپنی جانیں تک قربان کر دیں لیکن انہیں صوفیائے کرام کے جانشین اب وہ تھے۔ کہ اسلام کے ساتھ جن کی نادان دوستی نے دین و شریعت کا حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ جنہوں نے طریقت کو بزعم خود شریعت سے الگ قرار دیا اور دونوں کو الگ الگ کر دیا تھا۔ علماء کا میدان عمل اگر مساجد تک محدود تھا تو ان صوفیائے کرام کا محور سعی خانقاہیں تھیں۔ عجیب و غریب عقائد، طرح طرح کے مسائل انہوں نے پیدا کیے اور لوگوں میں پھیلا دیتے تھے۔ روحانیت کے نام سے انہوں نے جو مجموعہ عقائد بنا رکھا تھا۔ وہ وہی تھا کہ جس میں عجمی خرافات، ہندی ویدانت، اسرائیلی اور یونانی دیو مالا کی آمیزش تھی۔ یہ تو حال تھا مدعیان دین کے تصوف کا۔ اور دوسرا طبقہ تھا حاکمان وقت اور

صاحبان اقتدار کا۔ ان لوگوں کی نگاہ فقط اپنے مفاد تک رہتی تھی۔ اور ذاتی مفاد کے حصول کے لئے وہ ملت کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اسلامی مقبوضات پر اغیار کی یلغاریں ان کے سامنے تھیں۔ لیکن انہیں پرواہ نہ تھی۔ یہ اپنے عشرت کدوں میں جشن منایا کرتے تھے۔ صدیوں کے تمول اور امارت نے عیش و عشرت کے ایسے ایسے سامان مہیا کر دیے تھے۔ کہ ان کے طلسم میں ہر وقت ہی لوگ اسیر رہتے تھے۔ خلیفہ وقت کی حیثیت اگرچہ شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اپنی زندگی کا ہر لمحہ وہ بھی عشرت کوشی میں گذارتا تھا۔ خلفاء کے قصور و محلات اس زمانہ میں سامان تمول و عشرت کے لحاظ سے کسی طرح جنت کے قصور سے کم نہ تھے۔ عوام کی کمر ناجائز ٹیکسوں نے توڑ کر رکھ دی تھی۔ امیر غریبوں کا خون چوس رہے تھے۔ لیکن اس طبقہ کو اس کا ذرا برابر احساس نہ تھا۔

اس عالم دار و گیر میں حضرت ابو سعیدؒ کے مدرسہ سے وہ آوازۂ حق بلند ہوا۔ کہ جس کی اثر آفرینی کسی طرح صور اسرافیل سے کم نہ تھی۔ سیدنا عبدالقادر جیلانی اپنے وعظ میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کو اپنے مخصوص انداز میں ان کے فرائض سے آگاہ کیا کرتے تھے۔ علماء و مشائخ کی خامیاں۔ امرائے سلطنت اور خلیفۂ وقت کی کوتاہیاں ایک ایک کر کے جتایا کرتے تھے۔ آپ کی خانہ جنگی اور فرائض سے غفلت نے جو سنگین نتائج پیدا کیے تھے۔ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچتے۔ اور مسلمانوں کو صراط مستقیم سے ہٹ جانے سے ملت اسلامیہ کو جو نقصان پہنچا اور پہنچ رہا تھا۔ اس کی سنگینی سے آگاہ کیا کرتے تھے۔ چونکہ آپ کی آنکھوں نے ان خونیں انقلابات کو دیکھا تھا۔ جنہوں نے ملت اسلامیہ کی وحدت اور اسلامی سطوت کے رفیع الشان قصر کو زمیں بوس کر دیا تھا۔ آپ کو بغداد میں آئے ابھی ایک سال ہی گذرا تھا۔ کہ فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ عیسائی حکمرانوں نے ۴۹۰ھ میں ارض مقدس پر حملہ کیا اور صرف دو سال کے بعد یعنی ۴۹۲ھ میں اس سرزمین مقدس پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ دردمند اور حساس دلوں کے لیے یہ سانحہ عظیم قیامت سے کم تھا۔ قرامطہ تھے کہ عالم اسلام کے ایک بڑے حصہ پر انکا قبضہ تھا۔ ان کا زور کم ہوا تو ان کی جگہ

باطنیہ کی خون آشامیوں نے لے لی۔ ان تمام واقعات نے آپؒ کے سینہ کو درد سے معمور کر دیا اور زبان میں عجب تاثیر پیدا کر دی تھی ۔آپؒ کے مواعظ حسنہ نے کیا عوام اور کیا خواص سب کی آنکھیں کھول دیں۔ اور اب تک وہ جس خواب غفلت میں مدہوش تھے۔ اس سے بیدار ہونے لگے۔ اگرچہ خود پرست علماء گمراہی کے علمبردار صوفیا۔ و خود غرض امراء نے آپؒ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ لیکن استقامت دین کے جس فریضہ کو آپؒ نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ آپؒ کو اس سے کوئی خوف اور کوئی لالچ نہ ہٹا سکا۔ روایت ہے کہ خلیفۂ وقت نے آپؒ کی خدمت میں دو تھیلیاں اشرفیوں کی بھیجیں۔ کہ شاید شاہباز طریقت اس دام میں پھنس جائے۔ لیکن آپؒ نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ کے فرستادہ نے جب زیادہ اصرار کیا تو آپؒ کو جلال آ گیا۔ اور ایک تھیلی کو ہاتھ میں لے کر نچوڑنا شروع کر دیا تو اس میں سے خون ٹپکنے لگا۔ فرمایا ! یہ غریبوں کا خون ٹپک رہا ہے" ۔ حاضرین مجلس دم بخود رہ گئے۔ اور خلیفہ کا پیامبر خاموشی سے چلا گیا۔ اگرچہ آپؒ کی خدمت میں بیشمار نذرانے آتے تھے۔ لیکن خدام کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ شام تک ایک بھیجہ تک نہ رکھا جائے۔ بلکہ جو کچھ آئے وہ اسی وقت تقسیم کر دیا جائے۔ ایک دفعہ آپؒ نے بالا خانہ کی کھڑکی سے لنگر خانہ کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ شیطان الرجیم وہاں ٹہلتا پھر رہا ہے۔ اس نظارہ سے آپؒ پریشان ہو گئے۔ اور فوراً مودی خانہ کے ناظم کو بلایا اور پوچھا "کیا کوئی رقم تقسیم کرنے سے رہ گئی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ ہاں پانچ سو روپیہ بچ گیا ہے کیونکہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ آپ نے حکم دیا۔ " اسے فوراً باہر دے آؤ۔ کہ جہاں دولت جمع ہوتی ہے وہاں شیطان کے قدم آتے ہیں " ۔ عمل صالح اور خلوص کا یہ امتزاج تھا کہ چند دنوں میں آپؒ کی حکمرانی عوام و خواص ہر ایک کے دل پر ہونے لگی۔ اور وہ طلسم ٹوٹنے لگا۔ کہ جس میں مسلمان اسیر تھے۔ تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کیجئے تو یہ تبدیلی اور اثرات جو اس زمانہ میں آپؒ کی سعی و عمل سے مرتب ہوتے وہ صاف نظر آتے ہیں۔ دیکھیے جب آپؒ وارد بغداد ہوئے۔ تو اس وقت تخت خلافت پر مستظہر باللہ عباسی متمکن تھا۔ اس کی وفات کے بعد مسترشد باللہ اس کا جانشیں ہوا۔ یہ دونوں خلیفہ عمل سے خالی در

اپنی حالت پر قانع تھے۔ لیکن ۵۵۵ ھ میں جب المستنجد باللہ نے عنان خلافت سنبھالی تو حالت بدل گئی۔

خلافت کا اقتدار بحال ہونے لگا۔ بغداد اور اس کے نواحی علاقوں پر خلیفہ بغداد کا پورا تسلط ہو گیا۔ اور عظمت رفتہ کی سحر پھر سے عالم اسلام کے افق پر ظہور ہونے لگی۔ سعی و عمل کی جو راہیں اب تک مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل تھیں وہ پھر سے عیاں ہونے لگیں۔ چونکہ وہ آفتاب ولایت طلوع ہو چکا تھا۔ کہ زمانہ نے جس کے سر پر احیائے دین کا تاج رکھنا اور جسے محی الدین کے لقب سے سرفراز کرنا تھا۔

جاء الحق وزھق الباطل ہ ان الباطل کان زھوقا۔

احیائے دین کی جو بنیاد آپؒ نے رکھی تھی۔ اس کے نتائج نمودار ہونے لگے تھے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ جس چیز کا نام دین اسلام ہے۔ وہ چند ایک رسوم کا مجموعہ نہیں۔ وہ ایک لائحہ عمل ہے کہ جس کی پیروی کرنے سے مسلمان کے سر پر خلافت اللہ کا تاج رکھا جاتا ہے۔ سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کی سعی و عمل نے مسلمانوں کو یہ راہ سمجھا دی۔ اور وہ اپنا متاع گم گشتہ کی تلاش میں چل نکلے۔ اس دور میں دو آفتیں عالم اسلام پر مسلط تھیں۔ ایک تو تھی اندرونی اور دوسری بیرونی۔ اندرونی فتنہ قرامطہ و باطنیہ کا تھا کہ جنہوں نے مسلمانوں کے بھیس میں اسلام کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور بیرونی فتنہ تھا عیسایت کا۔ کہ جس نے ارض فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کر رکھا تھا۔ محی الدین والملت کی تحریر و تقریر کہ دونوں ہی نوائے سروش تھیں مسلمانوں کے لئے مشعل راہ بن گئیں۔ اور وہ ان دونوں اندرونی اور بیرونی فتنوں کے ـــــ مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ غنیۃ الطالبین جو آج تک طالبان حق کی آنکھوں کا سرمہ ہے آپؒ کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ آپؒ نے اس کتاب میں اس اندرونی فتنہ سے دنیا کے مسلمانوں کو پوری طرح آگاہ کر دیا۔ جو قلب اسلام میں ناسور کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ حسن بن صباح ۵۱۸ ھ میں فوت ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے جو پودا لگایا

حاشیہ :- تاریخ دعوت و عزیمت میں طبقات الحنابلہ کے حوالہ سے درج ہے۔

تھا اس کی نحوست کے برگ و بار زمانہ میں پھیل رہے تھے۔ سیدنا غوث الاعظمؓ کی تحریر و تقریر نے اس کے دجل و فریب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا۔ لیکن آپؓ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ارض اقدس کی بازیابی کی طرف متوجہ کیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سلجوقی فرماں رواؤں کے اتالیق و استاد اتابک کہلاتے تھے۔ ان اتابکوں کو حکومت و فرمانروائی میں بھی حصہ ملتا تھا۔ چنانچہ جب سلجوقی حکومت کا شیرازہ بکھرا۔ تو یہ سب اپنے اپنے علاقوں پر قابض و متصرف ہو گئے۔ "اتابکان شام" کی حکومت کی ابتدا ۵۲۱ ہجری سے ہوتی ہے۔ اتابک عماد الدین زنگی اسکا بانی تھا یہ ۵۴۴ ہجری میں فوت ہوا۔ اس کا جانشین اتابک نور الدین زنگی ہوا۔ اسی نے عیسائیوں سے محاربات کی ابتدا کی۔ آپ اس تدریجی ترقی اور علم اسلام کی بیداری سے کیا نتیجہ نکالتے ہیں؟ وہ آفتاب ولایت بلدہ بغداد میں ضوفشاں ہے کہ جس کی شعاعیں علم اسلام کے ہر گوشہ کو منور کر رہی ہیں۔ عوام جاگ رہے ہیں۔ امرا اپنے عشرت کدوں سے باہر آ رہے ہیں۔ بادشاہ جہاد کے لیے کمر بستہ ہو رہے ہیں۔ گویا ایک آن میں ہوا کا رخ بدل گیا۔ اور امام وقت کی پکار نے مسلمانوں کو سیدھے راستے پر لگا دیا۔

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

اتابک نور الدین زنگی ہی کے ہاتھوں عبیدین مصر کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اسد الدین شیر کوہ اس کا مقرر کردہ گورنر تھا۔ جس نے مصر پر قبضہ کیا۔ صلاح الدین ایوبی جو دولت ایوبیہ کا بانی اور فاتح بیت المقدس ہوا اسد الدین شیر کوہ کا برادر زادہ تھا۔ یہ درویش منش بادشاہ جو علم اسلام کا مرکز ثقل ہوا۔ فتح بیت المقدس کا خیال آخر کہاں سے لے کے چلا؟ بالکل آسان مسئلہ ہے۔ بغداد سے تابہ دمشق آخر ایک ہی آواز تو گونج رہی تھی۔ جگانے والے کی للکار اور بیدار کرنے والے کی پکار اتنی زبردست تھی۔ کہ ہر گوشہ میں پہنچ رہی تھی۔ فتوح الغیب جو آپؓ کے ارشادات کا مجموعہ ہے۔ اسے دیکھیے کہ ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ایک ایک فقرہ اثر آفرینی میں شمشیر دو

کا ہمسر ہے۔ آپ کی وفات کے صرف چار سال بعد یعنی ۵۶۵ھ میں صلاح الدین ایوبی والئ مصر بنتا ہے۔ اور ۵۶۹ھ میں نور الدین زنگی کے انتقال کے بعد مصر و شام کی حکومت کا تاج اس کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ شاہ جیلان کے دربار سے جو تڑپ یہ اپنے دل میں لے کر آیا تھا۔ اب اس کا اظہار یوں ہوتا ہے۔ کہ بادشاہت پر فائز ہوتے ہی صلاح الدین عیسائیوں سے جنگ آزمائی شروع کر دیتا ہے۔ اور صرف انیس سال کے عرصہ میں بیت المقدس کو فتح کر کے اپنے لیے دین و دنیا کی نیک نامی حاصل کرتا ہے۔ اور اپنی باقی زندگی کا عرصہ بھی عیسائیوں سے لڑنے میں گذار دیتا ہے۔ یہ فیضان تھا سیدنا عبد القادر جیلانی کے اخلاص و عمل کا کہ آخر اسلام کے ماتھے پر سے وہ داغ دور ہو گیا۔ جس نے اس کے چہرہ زیبا کو ۹۰ سال تک بد نما بناتے رکھا۔

آپ کے مریدوں۔ معتقدوں اور حلقہ بگوشوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آپ کے حلقہ بیعت اور سلسلہ رشد و ہدایت کا نام سلسلہ قادریہ ہے۔ سلسلہ قادریہ کی وسعت نے دیگر تمام سلاسل تصوف کو اپنے سایہ میں لے لیا۔ سلسلہ قادریہ کے حلقہ بگوش دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہیں۔ سلسلہ قادریہ کی وسعت و عظمت کا اندازہ اس روایت سے کیجئے۔ کہ میرے پاس سوڈان کے مشہور شہر "ام درمان" سے ایک صاحب علم و فضل تشریف لائے۔ دوران گفتگو جب ان کو معلوم ہوا۔ کہ میرا تعلق بھی بانی سلسلہ قادریہ سے ہے تو انہوں نے کہا کہ سلسلہ قادریہ کا وجود سوڈان میں بھی ہے۔ سبحان اللہ! سلسلہ قادریہ کی فرمانروائی اور جہاں بانی کے کیا کہنے۔ کہ دور دراز گوشوں میں بھی اس کا وجود ہے۔ آپ کی زندگی ہی میں آپ کے سلسلہ کی وسعت اور آپ کے نام کی شہرت دور و نزدیک پہنچ چکی تھی۔ آپ کی وفات کے وقت وہ ننھا سا پودا جو آپ نے حضرت ابو سعید کے مدرسہ میں بیٹھ کر لگایا تھا۔ اب ایک تناور درخت کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ منشاء خداوندی کے عین مطابق جب آپ اپنے فرائض سے عہدہ برا ہو چکے اور احیائے دین و ملت کا فریضہ پورا کر چکے۔ تو آپ کو اس عالم فانی سے عالم قدس کی طرف کوچ کا حکم مل گیا۔ آپ نے ۵۶۱ھ میں وفات پائی۔ بوقت وفات آپ کی عمر نوے سال تھی۔ بوقت رحلت صاحبزادہ اول نے وصیت کے لئے

گذارش کی۔ آپؒ نے صرف دو لفظ زبان مبارک سے فرمائے۔ "واتقو اللہ" (اللہ سے ڈرو) گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔

اک لفظ محبت کا اتنا ہی فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

اس لحاظ سے آپؒ نے کم و بیش ستر سال بغداد میں گذارے۔ اس عرصہ قیام میں اگر بیس سال آپؒ نے طلب علم و حصول سلوک و تصوف میں گذارے ہوں تو نصف صدی تک آپؒ نے درس ہدایت دیا۔ اور ان پچاس سالوں میں اتنا کچھ کر دکھایا کہ اور کوئی پانچ سو سال میں بھی اتنا نہ کر سکتا۔

مولانا انور شاہ کاشمیری نے بخاری کی شرح میں ایک حدیث بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"پانچویں صدی کے آخیر اور چھٹی صدی کے شروع میں میری امت پر ایک افتاد پڑے گی۔ اور اگر اس افتاد سے بچ گئی۔ تو پھر مستحکم ہو جائے گی"۔ شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحب کی روایت ہے۔ کہ میں نے کسی شخص کی آپؒ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی۔ بادشاہ اور وزراء آپ کی مجالس میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور ادب سے بیٹھ جاتے تھے۔ علماء و فقہاء کا کچھ شمار نہ تھا۔ ایک ایک مجلس میں چار چار سو دواتیں شمار کی گئیں۔ جو آپ کے ارشادات قلمبند کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

آپؒ کا سلسلہ نسب تیرھویں پشت میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ تک منتہی ہوتا ہے۔ یعنی ۱) سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ۔ ۲) سید ابو صالح۔ ۳) سید عبد اللہ۔ ۴) سید یحییٰ زاہد۔ ۵) سید محمد مورث۔ ۶) سید داؤد۔ ۷) سید موسیٰ ثانی۔ ۸) سید عبد اللہ مورث۔ ۹) سید موسیٰ الجون۔ ۱۰) سید عبد اللہ محض۔ ۱۱) سید امام حسن مثنیٰ۔ ۱۲) حضرت امام حسنؓ۔ ۱۳) سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

ذوق لطیف کہ بلند پایہ ہستیوں کی طبائع میں خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔ آپؒ بھی اس سے

حاشیہ ہو تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول صفحہ ۱۸۳

بہرہ ور تھے۔ بعض اوقات بے ساختہ آپ کی زبان مبارک سے اشعار نکل جاتے تھے۔ چنانچ
قصیدہ غوثیہ کے نام سے آپ کی ایک نہایت پر اثر نظم متداول و مقبول ہے۔ اور نعت میں آ
آپ ؓ کا ایک شعر ایسا ہے کہ اس پر دیگر شعراء کے ہزاروں اشعار قربان کیے جاسکتے ہیں۔

انفلت شموس الاولین و شمسنا
ابداً علی اُفُقِ العُلی لاتغرب

آپ ؓ نے یہ شعر نعت میں کہا ہے۔ لیکن آپ کے کارناموں پر یہ شعر کس خوبی سے صادق آ
ہے۔

از سرِ نو واقعات طور تازہ ہو گئے
ایک بجلی سی گرا دی آ کے چلمن کے قریب

آپ ؓ کے صاحبزادگان کی تعداد گیارہ تھی۔ جو تمام کے تمام آسمان علم و فضل کے آفتاب
ماہتاب تھے۔ اور آپ کی زندگی ہی میں اس مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ کہ جس کے حصول میں بعض
اوقات عمریں گذر جاتی ہیں۔ اور نہیں نصیب ہوتا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد اس مقص
کے حصول کے لیے جو آپ ؓ کے مد نظر تھا۔ ایران و عراق اور مشرق وسطیٰ کے دور دراز خطوں می
جا بسی اور سلسلہ قادریہ کی مشعلیں ہر مقام پر روشن کر دیں۔

ہندوستان میں سلسلہ قادریہ:-

البتہ ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کی تبلیغی کوششوں کا سراغ دسویں صدی ہجری تک مل
ہے۔ اس سے قبل جو بزرگ یہاں تشریف لائے۔ انہوں نے بلاشبہ یہاں بڑا بلند مقام حاصل کیا
لیکن سلسلہ قادریہ کی تنظیم کا عظیم الشان کارنامہ بعد کے بزرگوں نے ہی انجام دیا۔ کفرستان ہن
میں اشاعت اسلام کا فریضہ جن بزرگوں نے ادا کیا۔ وہ خواجگان چشت تھے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں ک
قبروں کو عنبریں کرے۔ کہ اس سرزمین کو انہوں نے اسلام کے نور سے منور کر دیا۔ اور بلاشبہ

انہیں نفوس قدسیہ کا فیض ہے۔

آں جا کہ بود نعرہ فریاد مشرکاں

اکنوں خروش نعرہ اللہ اکبر است

تاریخ کے صفحات ان بزرگوں کے کارناموں سے منور ہیں۔ دین متین کی تبلیغ اور شرع مبین کی ترویج ان حضرات کی زندگی کا مقصد اولین تھا۔ یہ جہاں قیام فرماتے وہیں ایک مستقل ادارہ قائم کر دیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں تبلیغ اسلام اور شریعت کے احیاء کے سلسلہ میں انہیں بے شمار مشکلات پیش آئیں۔ لیکن ان نیک نہاد بزرگوں نے کسی بھی مشکل کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا بلکہ جتنی زیادہ مشکلیں پیش آئیں اتنا ہی زیادہ ان کا ذوق تبلیغ بڑھتا چلا گیا۔ ایک طرف مقامی آبادی تھی۔ کہ جس پر صدیوں سے کفرو شرک کا غلبہ تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا گروہ تھا۔ کہ جس کے ہاتھ میں حاکمانہ اقتدار تھا۔ ان دونوں طبقوں سے نمٹنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ لیکن ان حضرات کی سعی و کاوش نے ان دونوں مشکلوں کو حل کر لیا۔ ان کا کردار بے داغ تھا۔ اور اطوار پسندیدہ تھے۔ جو شخص ان کی خدمت میں پیش ہوتا ان کی بلند روحانیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ غیر مسلم عوام کی طرف سے تو انہیں زیادہ سے زیادہ یہ شکایت تھی۔ کہ وہ اپنی مشرکانہ وضع پر سختی سے قائم رہتے تھے۔ لیکن حکمران طبقہ اور اس طبقہ کے ہمنوا علماء کا گروہ ان کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ان بزرگوں کی عوام میں مقبولیت سے کبھی تو سلاطین وقت کو بغاوت کی بو آتی تھی۔ اور گاہ علماء کرام کو ان کیطرف سے حسد کا مرض لاحق ہوتا تھا۔ کہ یہ باوجود بوریہ نشین ہونے کے عوام کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ اور علماء باوجود اپنی شان و شوکت اور شاہی دربار میں رسوخ کے اس مقبولیت سے محروم تھے۔ چنانچہ مخالفت کی آگ ایکدم بھڑک اٹھتی تھی۔ لیکن اس طرف سے صرف صبر جمیل کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سختیاں اور دشواریاں اگر پیش آتیں۔ تو انہیں خندہ پیشانی سے سہہ لیا جاتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس سرزمین کفر میں۔ بہار اسلام نے جلوہ دکھانا شروع کر دیا۔ اور چند ہی دنوں میں درودیوار قرآن پاک کی تلاوت سے گونج اٹھے۔ سرخیل خواجگان

چشت حضرت خواجہ بزرگ معین الدین اجمیریؒ نے سرزمین ہند کو پانچویں صدی ہجری کے وسط میں اپنے ورود مسعود سے مشرف فرمایا۔ اور اپنے لائق جانشینوں کی مدد سے اس عظیم الشان سلسلہ کی بنیاد رکھی۔ جس کی بدولت اس سرزمین میں اسلام کی برکات نمودار ہوئیں۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی اور اس بزم کی آخری شمع حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی تھے۔ کہ ان کی وفات کے بعد اس محفل کی رونق ختم ہو گئی۔

رفتم واز رفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

گویا سلسلہ چشتیہ کی روحانی حکمرانی کا دور کم و بیش ڈیڑھ سو سال تک ہندوستان میں قائم رہا۔ گو حضرت چراغ دہلویؒ کی وفات کے بعد جو ۷۵۷ھ میں واقع ہوئی۔ کئی نامور بزرگوں نے سلسلہ چشتیہ کا نام روشن کیا۔ لیکن ان بزرگوں کو وہ مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو ان کے پیشرووں کو حاصل تھی۔ اور کیسا عجیب اتفاق ہے کہ خاندانِ چشت کے اس شاندار دور کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔

وہ سرزمین ہند کہ جس نے ایک والتمش۔ بلبن و علاؤالدین اور تغلق کا شاندار دور دیکھا تھا۔ اب ایک اجڑا دیار تھی۔ کہ جس پر ہر مہم جو کا دست تطاول دراز ہوتا تھا۔

کفار و ہنود کے غلبہ نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ ان کے مساجد و مقابر اور مقدس مقامات مشرکین نے مویشیوں کے طویلے بنا لئے تھے۔ اجمیر کی حرمت کو رانا سانگا جیسے "کبر عظیم" نے داغدار کیا۔ اور شہر کو فتح کر کے تہہ و بالا کر دیا۔ یہی عالم چندیری، سارنگپور اور رنتھمبور کا تھا۔ کہ مسلمانوں کی کسی بھی قابل احترام جگہ کی حرمت باقی نہ رہی تھی۔

ادھر صوفیوں کے حلقوں میں صدر نشینان بزم کی اس دنیا سے رخصت کے بعد ہندوانہ رسوم نے نفوذ و اثر حاصل کر لیا تھا۔ ہنود میں موسیقی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ سلسلہ چشتیہ میں بعد کے لوگوں نے موسیقی کو بھی عبادت کا ہم پلہ بنا دیا۔ اور شریعت کا وہ چشمہ صافی جو آج تک حضرات

ت کی سعی و کوشش کے سبب تمام بیرونی اثرات سے پاک رہا تھا۔ اس میں غیر اسلامی عقائد کا
س و خاشاک نظر آنے لگا۔ اسی عالم میں ڈیڑھ سو سال بیت گیے۔ اور اس بزم تصوف کی ویرانی کم نہ
تی۔ جس کی صفا و رونق سے کبھی اسلامی ہند کا ہر گوشہ منور تھا۔ لیکن قانون قدرت یہ ہے کہ کوئی
بی ہو یا خرابی زیادہ دیر تک نہیں چلا کرتی۔ تا آنکہ قدرت نے ہندوستان کی فرمانروائی کا تاج
یر الدین بابر کے سر پر رکھا۔ جس نے ۹۳۳ھ ۱۵۲۹ء میں رانا سانگا پر فتح پا کر یہاں مغل
ومت کی بنیاد رکھی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے اس نئے دور کے ساتھ ہی یہاں تصوف کے اس سلسلہ
نے قدم رکھا۔ جس کا مقصد ابتداء ہی سے ترویج شریعت اور احیائے دین متین تھا۔ یہ سلسلہ
دریہ تھا۔ کہ جس نے ہندوستان کی بزم ہائے تصوف کی افسردگی کو نئے سرے سے رونق و جلا بخشی

عمریست کہ افسانہ منصور کہن شد

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

سلسلہ قادریہ کے بزرگوں میں سب سے پہلے حضرت مخدوم محمد گیلانی حلبی یہاں تشریف
ئے۔ اور اُچ میں توطن اختیار کیا۔ اس خاندان میں مخدوم عبدالقادر ثانی جیسے بلند مرتبہ شاہباز اوج
قت پیدا ہوئے۔ جن کی بدولت اولین مرتبہ اسلامی ہند میں سلسلہ قادریہ کی عظمت کا نقش قائم

قادریہ مجددیہ **سلسلہ**:۔ سلسلہ قادریہ کا وہ عظیم الشان کارنامہ جو آگے چل کر اکبری الحاد
لیے سد سکندری ثابت ہوا۔ ایسے بزرگوں کی تربیت اور نگاہ داری ہے۔ جو اس نازک وقت میں
جانوں پر کھیل گیے۔ اور سفینہ ملت کو اس دور کے خوفناک طوفان بلا سے صاف بچا لے گئے۔
سلہ قادریہ کی یہ شاخ جسے قادریہ مجددیہ کہنا چاہیے اور جس کی آغوش تربیت سے شیخ عبدالاحد
ہندی۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی۔ اور شیخ طاہر بندگی وغیرہم جیسے بلند مرتبت بزرگ

پرورش پا کر نکلے۔ میرا خیال ہے کہ خدمت دین کے لحاظ سے تمام خانوادہ ہائے تصوف پر فوقیت رکھتی ہے۔ سلسلہ قادریہ کی اس شاخ کے بانی حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رحمت اللہ علیہ ہیں جن کے حالات اور کارناموں کے متعلق اکثر تذکرہ نگاروں نے غفلت برتی ہے۔ اگر کہیں ان اور ان کے نامور جانشین حضرت شاہ سکندر قادری کا ذکر آیا ہے تو وہ چند سطروں سے زیادہ نہیں حالانکہ یہ وہ بزرگ ہیں۔ کہ جن کی ذات گرامی نے سلسلہ قادریہ مجددیہ کی بنیاد رکھی۔ اس وقت ہندوستان میں جتنی قادری مجددی، ظاہری اور فاضلی خانقاہیں ہیں ان کے رشتہ ارادت کی ڈور آپ کے توسط سے ہی اپنے مرکزی سرے تک پہنچتی ہے۔ انصاف کا تقاضہ تھا کہ ان بزرگوں کے حالات زندگی اور کارنامے وضاحت سے بیان کیے جاتے۔ لیکن خدا جانے وہ کیا اسباب تھے۔ تذکرہ نگار اس باب میں خاموش رہے۔ اخبار الاخیار جو ایک معاصرانہ تصنیف ہے۔ بڑی حیرت ہے کہ اس کتاب کے نیک نہاد مصنف بھی ان بزرگوں کے بارے میں خاموش ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی خاموشی اور ان بزرگوں کی طرف سے بے پرواہی شاید اس سبب سے ہو۔ کہ وہ ان دنوں حضرت مجدد الف ثانی سے برگزشتہ خاطر تھے۔ اور اسی کبیدگیِ طبع کے باعث ان حضرات کی طرف سے بھی اغماز برت گیے۔۔ بہر حال آئندہ اوراق اسی کوتاہی کی تلافی کے لئے وقف ہیں۔ اس کوشش کی گئی ہے کہ مفصل طریق سے ان ہر دو نامورانِ سلسلہ قادریہ کے حالات بیان کیے جائیں۔ جن کے متعلق آپ کے ہمعصر حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی اور شیخ جلال الدین تھانیسری یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ"

ملک العشاق شاہ کمال کیتھلی عاشقوں کے سردار ہیں۔ اولیاء اللہ کے قلوب اور احوال کو اللہ تعالیٰ نے ان کے قابو میں دے رکھا ہے"۔

شیخ نظام الدین بلخی تھانیسری کا بیان ہے کہ"

شاہ سکندر قادری سالکوں کے پیشوا، عارفوں کے امام اور دنیائے طریقت کے نور آفتاب تھے

"

فضائل سلسلہ قادریہ

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سید المرسلین حضور رسالت
مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اصحاب کے اختلاف
کے بارے میں جو وہ میرے بعد کریں گے، دریافت کیا تو وہ مجھے۔ بذریعہ وحی بتایا گیا۔ کہ اے محمدؐ
تیرے اصحاب ایسے ہیں جیسے آسمان پر ستارے۔ ان میں سے بعض بعض سے قوی ہیں۔ لیکن
سب کے سب نور ہیں۔ اس لیے آپؐ کے اصحاب میں اگر کوئی اختلاف ہو اور کوئی شخص کسی صحابیؓ
کی بات مان لے تو وہ شخص میرے نزدیک راہ راست پر ہو گا۔ پس میرے اصحاب ستارے ہیں۔
جو ان میں سے کسی کا مقتدی بنے گا وہ سیدھی راہ پائے گا۔ واضح رہے کہ اولیائے عظام اور صاحبان
طریقت حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام سے ہی متعلق ہیں۔ اور صحابہ کرام ہی
کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہیں اس لیے ان کے پیرو جس سردار طریقت کے راستے اور راہنمائی
میں چلیں، وہ بھی راہ راست پر ہوں گے۔ ان پیروؤں کو اپنے اپنے سردار طریقت کے سلسلے سے
موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر سلسلے کا الگ الگ نام ہے۔ مشائخ عظام فرماتے ہیں۔ کہ جس قدر
انسانوں کے سانس ہیں اسی قدر اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے ہیں۔ یہ سلسلے بے شمار ہیں۔ لیکن ان میں مشہور
ترین یہ ہیں۔ جو لوگ سید الطائفہ حضرت جنید کے پیرو ہیں انہیں جنیدیہ کہتے ہیں۔ جو لوگ حضرت
خواجہ عبد الواحد سے متعلق ہیں یا منسوب ہیں، انہیں زیدیہ یا واحدہ کہا جاتا ہے۔ شیخ ابوالحسن نوری کے
پیروؤں کو نوریہ۔ حضرت بایزید بسطامی کے پیروؤں کو طیفوریہ حضرت ابراہیم ادھم کے پیروؤں کو
ادھمیہ۔ حضرت حارث بن اسد محاسبی کے پیروؤں کو محاسبیہ۔ حضرت سہل عبد اللہ تستری کے
پیروؤں کو تستریہ۔ حضرت حمدون قصار کے پیروؤں کو قصاریہ۔ حضرت محمد بن علی ترمذی کے
پیروؤں کو حکیمیہ۔ حضرت شیخ ابو سعید خراز کے پیروؤں کو خرازیہ۔ حضرت شیخ عبد اللہ خفیف
کے پیروؤں کو خفیفیہ اور حضرت شیخ ابوالعباس سیار کے پیروؤں کو سیاریہ کہتے ہیں۔ یہ سلسلے

قدیم ہیں۔ متاخرین اولیائے کرام صاحب سلسلہ ہوئے ہیں۔ ان میں قادریہ چشتیہ۔ نقشبندیہ
سہروردیہ اور کبرویہ مشہور ہیں۔ کیونکہ متاخرین میں حضرت غوث الثقلین پیر دستگیر۔ حضرت خواجہ
معین الدین چشتی۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند۔ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی اور
حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ بہت مشہور ہیں۔ اس لیے مندرجہ بالا پانچ سلسلوں کے نام
الترتیب انہی بزرگوں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذکورہ بالا بزرگ جملہ مومنین کے مقبول ہیں اور
خواص و عوام میں کوئی فرد ان سلسلوں سے باہر نہیں ہے۔ اور تمام عالم کے گردن فرازوں کو ان کی
غلامی اور مریدی کرنا پڑتی ہے۔ اور ان سلسلوں کے مقتدا کامل۔ عارف۔ واصل اور متہدی ہیں۔
لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور اولیاء سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور فرمایا ہے
"فضلنا بعضہم علی بعض"۔ اور پھر فرمایا ان فضل اللہ یوتیہ من یشاء" یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم
نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ اور کہ فضیلت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جسے چاہتا ہے عنایت
کرتا ہے۔ جو امتی زیادہ عالی مرتبت اور صاحب کمال ہو گا۔ سمجھ لو کہ اس پر حضور رسالت مآب
صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر شفقت اور عنایت زیادہ سے زیادہ ہے۔ وہی سب سے زیادہ بہتر اور
بزرگ ہو گا۔ جس کو حضور رسالت مآب ﷺ پناہی کا زیادہ قرب حاصل ہو گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے
حضرت غوث الثقلین محی الدین عبد القادر جیلانی کو فضیلت دی ہے اور قدمی ھذا علی رقبتہ کل ولی
اللہ" کہنے پر مامور فرمایا ہے۔ اور تمام مقرب فرشتوں، اولیائے متقدمین و آخرین کی مجلس میں
(جو زندہ تھے وہ از روئے جسم اور جو فوت شدہ تھے وہ از روئے روح حاضر مجلس تھے) حضور
رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت غوث الثقلین محی الدین جیلانی محبوب سبحانی کو خاص
خلعت اپنے خاص دست مبارک سے پہنائی تھی۔ اور روئے زمین پر کوئی ایسا ولی نہ رہا تھا۔ جس نے
حضرت غوث الثقلین ؓ کے روبرو گردنِ تسلیم خم نہ کی ہو۔ حضرت میراں شاہ میر فرماتے ہیں کہ
"قدمَی ہٰذا کُلِ وَلِیِ اللہ" کے معنی یہ ہیں کہ میرا طریق سب طریقوں سے اعلیٰ ہے۔ قدم سے مراد
طریقہ ہے۔ اور تمام اولیاء نے جو گردن جھکائی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کو تسلیم

کر بل علی راسی وعینی بھی کہا کہ (بلکہ آپکا قدم میرے سر آنکھوں پر) یہ ویسا ہی قصہ ہے کہ حضرت ابراھیم خلیل اللہ علیہ اسلام کی آواز کو حق تعالی نے تمام عالم میں پہنچا دیا تھا۔ حتی کہ ارواح نے اپنے ماں باپ کی پشت اور رحم میں سے جواب دیا لبیک لبیک ۔۔۔ بالکل اسی طرح حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی آواز خلیل اللہ کی ہی آواز تھی

جس کو تمام عالم کے اولیائے وقت نے سنا۔ خدا نے سب کو یہ آواز پہنچا دی۔

شیخ جمال العارفین ابو آلوةؒ فرماتے ہیں کہ میں نے غوث الثقلین کے بارے میں حضرت خضر علیہ السلام سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے حضرت غوث الثقلین کو تمام ولیوں سے اعلی مرتبہ دیا ہے۔ اور سب سے اعلی اور عمدہ شربت اپنی محبت کا چکھایا ہے۔ پھر یہی بزرگ فرماتے ہیں کہ مجھ کو شیخ عبدالقادرؓ کے سر پر ایسا نور دکھائی دیتا ہے۔ جس کی شعاعیں مشرق اور مغرب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر آپ نے حضرت غوث الثقلینؓ کیطرف غائبانہ طور پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اے شیخ! اب تو ہمارا زمانہ ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں تمہارا زمانہ آئے گا۔ جب ہر مرغ کی زبان بند ہو جائے گی۔ مگر تمہارا طوطی قیامت تک بولتا رہے گا" "اس عجمی جوان کا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہو گا

جوانی کے ایام میں حضرت غوث الثقلین شیخ حماد کی صحبت میں بیٹھے تھے۔ جب آپؓ اٹھ کر باہر تشریف لائے۔ تو شیخ حماد نے فرمایا۔ "اس عجمی نوجوان کا قدم تمام اولیا اللہ کی گردن پر ہو گا" شیخ ابو سعید قیلویؒ نے فرمایا کہ "حضرت غوث الثقلینؓ زمین کی نسبت آسمان میں زیادہ مشہور ہیں " حضرت غوث الثقلینؓ خود فرماتے ہیں۔ "ہر ایک ولی کسی نبیؑ کے قدم پر ہے۔ اور میرا قدم اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر ہے۔ جہاں انہوں نے قدم رکھا وہیں میں نے قدم رکھا۔ مگر نبوت کے قدم میں مجھ کو راہ نہ ملی"

امام یافعی فرماتے ہیں کہ حضرت غوث الثقلینؓ کی بارگاہ سے نقشبندیہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ اور کردیہ سلسلوں کے مشائخ کو کافی حصہ ملا ہے۔ وہ اس طرح کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری

کر لیا کہ حضرت غوث الثقلین کا طریق یا مسلک سب سے اعلیٰ ہے۔ شیخ خلیفۃ الاکبر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیخ عبد القادر جیلانی نے قدمی ھذا علی رقبۃ کل ولی اللہ کا اعلان کیا؟۔ تو سرکار دو عالمؐ نے ارشاد فرمایا" فکیف لاوھو العطب وانا ارعاہ یعنی شیخ عبد القادر جیلانی نے سچ کہا ہے اور وہ کیوں نہ کہے۔ جبکہ وہ قطب زمانہ اور میرے زیر نگرانی ہیں۔" علامہ عبد القادر الاربلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ولی بنانا چاہتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ اسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کرو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اسے پیش کیا جاتا ہے۔ تو آپؐ فرماتے ہیں اسے میرے بیٹے سیدنا عبد القادر کے پاس لے جاؤ۔ تاکہ وہ اس کی قابلیت اور استحقاق منصب ولایت کے لیے دیکھیں۔ پھر غوث پاک اس کا نام دفتر محمدیہؐ میں لکھ کر مہر لگا دیتے ہیں اور اسے دوبارہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالیہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام اپنے بیٹے کی رائے اور فیصلہ ملاحظہ فرما کر اس کے بارہ میں قطعی حکم جاری فرماتے ہیں۔ بس اس کو ولایت کی خلعت عطا کی جاتی ہے۔

جب حضرت غوث اعظمؓ نے قَدَمِی ہٰذا علی رَقَبَۃِ علی کُلِ وَلِیِ اللہ کہا تو شیخ احمد رفاعی نے اپنی گردن جھکا کر عرض کیا علیٰ رُقبتِہٖ عَلیٰ رَقبہ یعنی میری گردن پر میری گردن پر۔ اس موقع پر حاضرین مجلس نے عرض کیا۔ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ تب آپ نے ارشاد فرمایا کہ" اس وقت بغداد میں حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒؓ نے قدمی ھذا ئی رقبۃ کل ولی اللہ کا اعلان فرمایا ہے۔ اور میں نے اپنی گردن جھکا کر تعمیل ارشاد کی ہے۔"

شیخ ابو عمران موسیٰ نے ایک روز حضرت شیخ عقیل سے دریافت کیا کہ اب قطب کون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ مکہ مکرمہ میں پوشیدہ ہے۔ پھر عراق کی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ یہاں سے ایک بزرگ ظاہر ہو گا۔ اور وہ قدمی ھذا علی رقبۃ کل ولی اللہ کہے گا۔ جس کی آواز پر اول اور آخر کے تمام اولیاء اللہ اپنی گردنیں جھکا دینگے۔

حضرت جنید بغدادی نے ایک دن مراقبہ سے سر اٹھایا اور فرمایا۔ "اس کا قدم میری گردن پر اس کا قدم میری گردن پر"۔ خدام کے استفسار پر فرمایا کہ "پانچویں صدی ہجری کے آخر میں ایک بزرگ کا ظہور ہو گا۔ اس کا نام عبد القادر اور لقب محی الدین ہو گا۔ جیلان میں اس کی ولادت ہو گی۔ اور وہ بغداد میں سکونت پذیر ہو گا۔ ایک دن حکم الٰہی سے وہ کہے گا میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے۔ میں نے بحالت کشف اس کی عظمت دیکھ کر کہا ہے کہ اس کا قدم میری گردن پر ہے"۔

شیخ ابو محمد بطائحی کا بیان ہے کہ امام حسن عسکریؓ نے بوقت وصال اپنا جبہ مبارک شیخ معروف کرخی کے سپرد کر کے وصیت فرمائی کہ یہ امانت شیخ عبد القادر جیلانی تک پہنچا دینا۔ وہ میرے بعد پانچویں صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہو گا۔ اور وہ تمام اولیاء اللہ کا سر تاج ہو گا۔

حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری نے بخاری کی شرح میں ایک حدیث بیان کی ہے کہ حضور ختم المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچویں صدی ہجری کے آخر میں میری امت پر ایک افتاد پڑے گی۔ اگر اس افتاد سے بچ گئی تو پھر مستحکم ہو جائے گی۔

سلسلہ نقشبندیہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے بھی فیض پہنچا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کو جس طرح حضرت صدیق اکبرؓ سے ارادت حاصل رہی ہے اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت امام حسن علیہ السلام سے بھی حاصل رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت امام جعفر صادقؓ کو جس طرح اپنے نانا امام قاسم بن محمد بن ابو بکر صدیق سے انتساب ہے اسی طرح ان کو اپنے والد حضرت امام محمد باقر سے بھی ارادت حاصل ہے۔ حضرت امام قاسمؓ بن محمد بن ابو بکرؓ صدیق کو حضرت امام زین العابدینؓ سے بھی نسبت ہے۔

شیخ ابو القاسم گورگانی کو کئی واسطوں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے انتساب ہے۔

خلاصۃ الفوائد سے منقول ہے کہ حضرت شیخ کلیم اللہ ولی شاہ جہاں آبادی نے اپنے بیٹوں کو سلسلہ قادریہ میں بیعت کرایا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سلسلہ چشتیہ بہشتیہ میں بڑی محنت کی ضرورت ہے اور حضرت غوث الاعظمؓ کا دامن بڑا فراخ ہے۔ جس میں ہر شخص کے چھپنے کی گنجائش

موجود ہے۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے حضرت غوث اعظمؓ کے قول قدمی ھذا علےٰ رقبۃ کل ولی اللہ کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا گردن تو درکنار آپؓ کا قدم مبارک علیٰ عینی

علےٰ بصیرنی یعنی میری آنکھوں پر ہے۔ خواجہ صاحب کے یہ اشعار حضرت غوث اعظمؓ کے روضہ مبارک پر کندہ ہیں۔

بادشاہ ہر دو عالم شاہ عبدالقادرؒ است
سرور اولاد آدمؑ شاہ عبدالقادرؒ است
آفتاب و ماہتاب عرش و کرسی و قلم
نور قلب از نور اعظم شاہ عبدالقادر است

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے زمانہ مبارک سے تا قیامت جتنے اولیاء اللہ ابدال، اقطاب، اوتاد، نقبا، نجبا، غوث یا مجدد ہونگے سب فیضان ولایت و برکات طریقت حاصل کرنے میں حضرت غوث اعظمؓ کے محتاج ہونگے بغیر ان کے واسطے اور وسیلے کے قیامت تک کوئی شخص ولی نہیں ہوسکتا۔

مجدد الف ثانی حضرت غوث اعظمؓ کا نائب ہے۔ جس طرح سورج کا پرتو پڑنے سے چاند منور ہوتا ہے اسی طرح مجدد الف ثانی پر بھی تمام فیوض و برکات حضرت غوث اعظم کی بارگاہ سے فائض ہو رہے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ جو قضا لوح محفوظ میں بہ شکلِ مبرم لکھی ہوئی ہے اور اسکی تعلیق صرف علم خداوندی میں ہو ایسی قضا میں بھی باذن اللہ تصرف فرما سکتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی قدمی ہذا علیٰ رقبۃِ کلِ ولی اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس وقت جتنے اولیاء اللہ زمین پر تھے سب نے اس آواز کو سنا اور گردنیں جھکا دیں۔ بلکہ بعض نے گردن جھکا

ماخذ:۔ تفریح الخواطر۔ بہجت الاسرار۔ قلائد والجواہر۔

بغداد پہنچ کر حضرت غوث الثقلینؓ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ آنجنابؓ نے خواجہ صاحب کو کچھ مہینے اپنے حجرہ مبارک میں رکھا اور توجہ فرماتے رہے۔ خواجہ یوسف ہمدانی بغداد میں حضرت غوث الاعظمؓ کی صحبت میں رہے۔ سلسلہ سہروردیہ سے شیخ الشیوخ کے چچا حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردی جو شیخ عماد کے پیر ہیں۔ اور شیخ عماد شیخ نجم الدین کبریٰ کے پیر ہیں۔ اور شیخ شہاب الدین سہروردی ہمیشہ حضرت غوث الثقلینؓ کی خدمت و صحبت میں حاضر رہا کرتے تھے۔ یہ شیخ ابوالنجیب جب حضرت غوث الثقلینؓ کی خدمت میں روانہ ہوتے تو اپنے اصحاب کو فرماتے کہ "وضو کر لو۔ اور اپنے دلوں کی نگہداشت کر لو۔ اور خبردار ہو جاؤ۔ کیونکہ میں ایسے شخص کی خدمت میں جاتا ہوں جس کا دل اللہ تعالیٰ سے تعلیم حاصل کرتا ہے" شیخ الشیوخ فرمایا کرتے تھے۔ "مجھے جو کچھ ملا ہے وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملا ہے"

امام عبداللہ یافعی فرماتے ہیں کہ "شیخ عبدالقادر فرمایا کرتے تھے کہ جس نے مجھے دیکھا ہے۔ یا میرے مدرسے میں پہنچ گیا ہے اس سے قبر اور قیامت کا عذاب اٹھالیا جاتا ہے" سلسلہ قادریہ صحو، کثرت فتوح اور عدم لغزش پر مبنی ہے۔ صحو سے مراد مرادوں کا حاصل ہونا اور حال کی صحت ہے۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظمؓ فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص میرا مرید ہو اور اس کی سواری کا قدم پھسلے تو میں قیامت تک اس کا محافظ ہوں"

سلسلہ قادریہ کے فضائل میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو صرف اس قدر ہے جیسے کسی دریائے بے پایاں سے ایک گھونٹ حاصل کر لی جائے۔ تاہم عوام اور اہل عقیدت کی اطلاع اور اپنی عقیدت اور ارادت کے اظہار کے لیے یہ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ذرہ ناچیز خورشید منور کی تفسیر کا حق ادا کیا کر سکے گا۔ ایک ذرہ بے بساط سے ایک بحر بیکراں کی تشریح و تفصیل کس طرح ہو سکے گی۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام

تاریخ اسلام کا یہ عجیب تضاد ہے کہ جہاں بنو امیہ کے دامن پر ظلم و جور و طغیان و سرکشی

کے داغ اور بزرگان دین کے مقدس خون کے چھینٹے نظر آتے ہیں۔ وہیں ان کی پیشانیاں فتوحات اقطاع عالم اور اشاعت اسلام کے نور سے منور نظر آتی ہیں۔ ان کے حاشیہ نشینوں میں وہ سفاک بھی تھے جن کے خنجر تغلب اسلام کو زخمی کرنے سے نہ چوکے اور اسی دربار میں وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کی شمشیر کی چمک اور تابانی نے کفر کی ظلمت کو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ حجاج بن یوسف کی تلوار نے اگر عالم اسلام کو خون میں نہلا دیا تو اسی کی تدبیریں تھیں جنہوں نے دنیا کے بڑے حصہ کو حلقہ بگوش اسلام بنا دیا۔ سلاطین بنو امیہ کے تربیت یافتہ سپہ سالاروں کی یلغاروں نے زمین کے چپے چپے کو دھو ڈالا۔ اور ایسے ایسے کارہائے نمایاں کر دکھائے جن سے تاریخ اسلام کے ابواب زرین حروف سے لکھے گئے۔ منجملہ اور فتوحات کے غربی ہند کی فتح کا سنہری کارنامہ اسی بدنام زمانہ حجاج بن یوسف کے جواں سال عزیز محمد بن قاسم کے ہاتھوں سر انجام پایا۔ ہرچند کہ اسلامی فوج کی سندھ پر فوج کشی سراسر سیاسی اسباب کی بناء پر عمل میں آئی۔ لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ محمد بن قاسم کی قیادت میں جو فوج کشی سندھ پر ہوئی اور جو فتوحات عمل میں آئیں انہوں نے ہندوستان میں اشاعت اسلام کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ہندو قوم جو ہزاروں سالوں سے ایک فرسودہ اور بے جان نظامِ حیات کی پیرو کار تھی، وہ سرزمین جہاں ذات پات کی ناگوار پابندیوں نے انسانی آبادی کے ایک کثیر گروہ کو غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ جب یہاں وہ لوگ آئے جن کی موت و حیات حرکت و عمل۔ عبادات و رسوم ایک ذات واحد کی مرضی کی پابند اور جنگی زندگی کا ہر لمحہ اسی معبود حقیقی کی رضا جوئی میں بسر ہوتا تھا، جن میں ذات واحد کی مرضی کی پابند اور جنگی زندگی کا ہر لمحہ اسی معبود حقیقی کی رضا جوئی میں بسر ہوتا تھا جن میں ذات پات کی قیود نہ تھیں۔ جن کے اعمال مکر و ریا سے عاری اور جنگی سیاست ظلم و جور سے سراسر خالی تھی۔ عربوں نے یہاں جو نمونہ اپنی عملی زندگی پیش کیا۔ وہ اتنا سحر آفریں اور کشش انگیز تھا کہ چند دنوں کے اندر اندر زیریں اور بالائی سندھ مین اسلام پھیل گیا۔ ایک بڑا سبب یہ بھی اشاعت اسلا

ہی معاون ہوا کہ جس قانون کی پابند عرب قوم تھی اس میں شاہ و گدا کی تمیز نہ تھی ۔ ایک ہی قانون تھا جو بندہ آقا پر فرمانروائی کرتا تھا ۔ جہاں راجاؤں کو چاند اور سورج کی اولاد سمجھا جاتا اور برہمنوں کو خدائی طاقت کا حاصل جانا جاتا تھا ۔ اس ملک میں جب عربوں نے قرآن کے قانون کو پیش کیا ۔ جو دنیا بھر کے اعلیٰ قوانین پر فوقیت رکھتا تھا ۔ اور جس میں تمام انسانی روگوں کا علاج موجود تھا تو ہندوستان کے باشندوں کی آنکھیں کھل گئیں ۔ اور انہیں اسی قانون کی آغوش میں دین و دنیا کی فلاح نظر آئی ۔

محمد بن قاسم کے پنجسالہ دور حکومت میں تمام سرزمین سندھ پر نخل اسلام سایہ فگن ہونے لگا ۔ اور اس سرزمین پر آفتاب ہدایت کی شعاعیں پھیلنے لگیں ۔ جہاں قرن ہاقرن سے کفر کی ظلمت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے ۔ محمد بن قاسم جب اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی منتقمانہ سیاست کا شکار ہوا تو چند دنوں کے لیے اس چمن کی بہاریں فرق پڑ گیا ۔ جسے نوجوان سپہ سالار کی عقل و دانش ہمت و محنت اور ایمان کامل نے رشک صد بہار بنا دیا تھا ۔ ستم رسیدہ محمد بن قاسم کے بعد اس ملک میں جتنے حکمران بھی آئے ہر چند کہ وہ اپنے پیشرو کی سی بلند نظری اور جواں ہمتی نہ رکھتے تھے لیکن پھر بھی جو بیج یہاں بو دیا گیا تھا ۔ وہ نہایت تیزی سے بڑھتا اور پھولتا پھلتا چلا گیا ۔ جب زمانہ نے بنو امیہ کی حکومت کا ورق الٹا اور تاج سروری بنو عباس کے سر پر رکھا تو سندھ کی حکومت میں بھی تنزل پیدا ہوا جس سے یقیناً اشاعت اسلام میں فرق پڑا ۔ لیکن دارالخلافت بغداد کے بیدار مغز حکمرانوں نے جلد ہی اس طوائف الملوکی پر قابو پا لیا ۔ اور جس آفتاب کی شعاعوں پر وقت کی ظلمت نے عارضی طور سے پردہ ڈال دیا تھا ۔ وہ بدستور اپنا نور پھیلانے لگا ۔

قدرت کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ہر کمال کے بعد زوال کی ابتدا ہوتی ہے ۔ تغیر کا قانون تمام عالم کائنات میں جاری و ساری ہے ۔ نصف النہار پر پہنچتے ہی ۔ سورج ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور بہار جب عین گل پاشی میں مصروف ہوتی ہے تو بزم گل میں خزاں اپنا قدم جمانا شروع کر دیتی ہے ۔ سرزمین عرب سے ابھرنے والا آفتاب جب عین اپنے کمال پر پہنچا تو اس کو گہن لگنا شروع ہو گیا ۔ عربوں نے پوری دو صدیوں تک اقصائے عالم میں اپنا قدم جمائے رکھا اور جہانبانی و جہانگیری

کے وہ نقش تاریخ کائنات کے اوراق پر ثبت کیے کہ جہانگیری اور جہاں بینی کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ سے روشن رہیں گی۔ بنو عباس کے سر اقبال پر تاج سروری ایرانیوں نے رکھا۔ اور اس خاندان نے جو اورنگ شہنشہی کو زینت بخشی تو وہ سراسر ایرانی دانشمندی کی رہین منت تھی۔ لیکن ابتدا۔ میں یہ رنگ گہرا نہ ہو سکا۔ عربی عروج کی ہیبت تا ہنوز دلوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اور دنیا کو بادیہ نشاں عرب کی یلغاریں اب تک فراموش نہ ہوئی تھیں۔ لیکن تیسری صدی ہجری کی ابتدا۔ ہوتے ہی ہوا کا رخ بدلنا شروع ہوا۔ وہ محفل درہم برہم ہونے لگی۔ جن چاند تاروں کی روشنی اس انجمن کی زینت تھی، ایک ایک کر کے جھلملانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے عربی سطوت و جلال ایک فسانہ بن کر رہ گئے۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہوتے ہی علاقائی خود مختاری اور طوائف الملوکی کی بدعت چل نکلی۔ ہر طرف طالع آزماؤں نے اپنی اپنی انجمن سروری آراستہ کرنی شروع کر دی۔ یہی کیفیت سندھ میں ہوئی کہ دربار بغداد کی گرفت کمزور ہوتے ہی ہر گورنر نے اپنی بساط جہاں آرائی علیحدہ قائم کر لی۔ چنانچہ زیریں، بالائی اور وسطی سندھ میں تین خاندانوں نے حکومت کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ یہ امور ہمارے موضوع سے متعلق نہیں لیکن ضمناً ان کا تذکرہ نہایت ضروری تھا۔ کسی قانون کا مرکزی نقطہ خیال اس کے پیرو کاروں کی نگاہ سے اگر اوجھل ہو جائے تو یقیناً اس کا رد عمل صادر ہو گا۔ صحرا نشینان عرب کی یلغاروں اور ترکتازیوں کا مدعا فقط جہانگیری اور کشور کشائی ہی نہ تھا بلکہ اعلائے کلمتہ الحق بھی تھا۔ وہ جہاں جہاں بھی اپنی فرمانروائی کے پرچم اڑاتے گئے وہیں انہوں نے نقش توحید کا سکہ بھی دلوں پر بٹھا دیا۔ یہ ایک ایسی قوم تھی جس کا ہر لمحہ عمل کی لذت سے سرشار تھا۔ اور اس عمل کا نتیجہ اشاعتِ اسلام ہوتا تھا۔ جب تک عربوں کا عروج رہا ان پر اسلامی ضابطہ حیات مسلط رہا۔ یہ وہ نظام تھا۔ کہ اس پر عامل ہونا ہی دعوت اسلام و توحید تھا۔ اسے لوگوں کو کسی مخصوص تبلیغی مشن کی حاجت نہ تھی۔ ان کا ہر فرد نمونہ اسلام اور ان کی ہر حرکت دعوت توحید تھی۔ لیکن جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ جب خالص عربی تفوق اور ان کا حاکمانہ اقتدار زوال پذیر ہوا تو اشاعت اسلام کی رفتار اچانک رک گئی۔ اور وہ مقصد جس کے لیے یہ قوم بساط عالم پر

نمودار ہوتی تھی حکومت اور اقتدار کی کشمکش میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ وہ سرزمین جس کے ذرہ ذرہ پر
رنگ توحید نقش تھا اونی قسم کی سیاسی معرکہ آرائیوں کا شکار بن گئی۔ صرف اندلس ہی ایسا خطہ تھا
جہاں عربی سطوت و جلال کے نقوش تادیر قائم رہے۔ ورنہ تمام اسلامی دنیا میں دو سو سال کے بعد
ہی عربوں کی سطوت کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ سرزمین ہند و سندھ میں جو حکومتیں طوائف الملوکی
کے دوران قائم ہوئیں ان کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا ہی سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ تمام عالم
اسلام میں ایک جمود و سکوت طاری تھا۔ جس کی صدائے بازگشت ہر جگہ سنائی دیتی تھی۔ چشم عالم نے
جو نظارے عربی شہسواروں کی یلغاروں کی صورت میں دیکھے تھے ان کے صفحہ ہستی سے محو ہو جانے
کے بعد عالم یاس و نومیدی طاری ہونا لازمی تھا۔

صوفیائے کرام:۔ لیکن خلاقِ دو عالم کو دین اسلام کی بقا منظور تھی۔ عربوں کا طلسم جہانبانی
جب ٹوٹ گیا۔ تو ہند میں اشاعت اسلام اور ترویج دین متین کی بنیاد ایک اور رنگ میں رکھی گئی۔ ہر
چند کہ یہ رنگ ابتدائی عہد اسلام سے قطعی مختلف تھا۔ لیکن اتنا گہرا اور پائیدار تھا کہ اسے ہر طرح
صبغتہ اللہ کہنا بجا تھا۔ وہ بزرگ ہستیاں اور نفوس قدسی جن کے سینے نور ایمان سے منور اور جن کی
نگاہیں جلوہ توحید سے روشن تھیں۔ انہوں نے قبائل کو جب باہمی آویزشوں میں مبتلا دیکھا اور
حکمرانوں کو اپنے تخت و تاج کی بقا میں مصروف پایا تو یہ گروہ مقدس اپنے وطن سے نکلا۔ نہ خدم و
حشم ان کے ساتھ تھا۔ نہ فوج و خزانہ ان کے ہمراہ۔ ایک دھن تھی، ایک تمنا تھی جو دیوانہ وار انہیں
لیے پھرتی تھی۔ نہ خواہش تحسین و آفرین تھی۔ نہ حزن و ملال کا خوف۔ اشاعت اسلام کا جو فریضہ
اجتماعی کوششوں کا مرہون منت تھا اس کا بار ان افراد کے کاندھوں پر آپڑا تھا۔ دنیا کا کوئی گوشہ
ان درویشوں کی بادہ پیمائی سے خالی نہ رہا۔ ہندوستان میں ان فرشتہ سیرت لوگوں کی آمد چو تھی صدی
ہجری میں شروع ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے اپنی سیرت، اخلاق اور بلند کردار کے باعث وہ کام کر
دکھایا جو شاہان وقت سے نہ بن آیا تھا۔ عربوں کے زوال کے بعد ترک اقوام نے وسط ایشیا میں غلبہ پا

لیا تھا۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھنے والے یہی ترک تھے۔ لیکن ان اقوام کا نظریہ حیات عربوں سے قطعی مختلف تھا۔ ہرچند کہ ان میں سے اکثر بادشاہوں کی سیرت و کردار بہت بلند تھا اور وہ اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ جو عین اسلامی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن عربی کردار و سیرت سے یہ چیز قطعی علیحدہ تھی۔ ان کا زیادہ تر نظریہ بقائے حکومت اور قیام سلطنت تھا۔ رہے اہل علم، ان کی آزادیِ رائے کو مدرسہ نے محدود کر دیا تھا اور وہ بلند نظری جو صحرا نشین افراد کا خاصہ ہے ان علمائے کرام میں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ ان میں سے اکثر تو عہدوں کا لالچ اور شاہان وقت کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اشاعت اسلام کا میدان صرف ان اصحاب کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا جنکو ہم اپنی زبان میں صوفی۔ درویش یا اولیاء اللہ کہہ سکتے ہیں۔

اولیاء اللہ:۔ نبوت کے متعلق ایک واضح نظریہ موجود ہے۔ کہ وہ ایک ایسا منصب ہے جو تمام دینی اور دنیاوی امور پر احاطہ کیے ہوتے ہے۔ اور یہ انبیائے کرام علیہم السلام انسانیت کی تربیت اور تعمیر ہر رنگ میں کرتے ہیں۔ نبیؑ بیک وقت واضح قوانین بھی ہوتا ہے اور مسند حکمرانی پر فائض بھی۔ افواج کی سالاری بھی اس کے ذمے ہے اور سجادۂ ہدایت کو بھی وہی زینت دیتا ہے۔ غرضیکہ نبوت کے فرائض میں وہ تمام امور شامل ہیں جو نوع انسانی کو ابتدا سے انتہا تک پیش آسکتے ہیں۔ ولایت بھی نبوت کا ایک پرتو ہے۔ اولیاء اللہ کو اگرچہ مامور من اللہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ان کے عمل کی دنیا بھی جزوی طور سے نبوت سے ہم آہنگ اور اس کی پیرو کار ہوتی ہے۔ ذاتی سیرت و کردار کو عین سنت نبوی کے مطابق ڈھالنے کے علاوہ اولیاء اللہ نے ہجرت بھی اختیار کی اور اپنے قیام کے لیے وہی مقامات منتخب کیے جہاں کفر کی تیرگی زوروں پر تھی۔ اپنی تمام زندگی ان بزرگوں نے اِس مقصدِ عظیم کے لیے وقف کر دی جس کے لیے سرکار دو جہاںؐ والیِ کون و مکاں جناب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ان کی زندگیاں آفتاب سے زیادہ

روشن تھیں۔ اپنی ذات کو انہوں نے کبھی مقدم نہ جانا۔ ان کی حیات کا ہر ثانیہ ایک ہی مقصد میں مصروف تھا۔ اشاعت اسلام قرآن پاک ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ ان کی خانقاہ ں میں ہر وقت ایک ہی آواز گونجتی تھی اور وہ آواز تھی کلام الٰہی کی جس کی جلوہ ریزیاں اور صاعقہ پاشیاں خانقاہوں کی محدود دنیا سے نکل کر سرزمین ہند کی وسعتوں میں پھیل گئی۔ قرآن پاک کی اولیاء اللہ کے متعلق شہادت ان اصحاب پر صادق آتی تھی لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ وہ مقامات جہاں مسلمانوں کا قدم رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا یہ بزرگ وہاں ویرانہ جاتے اور بے غل و غش اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ وہ راستے جو عرب شہسواروں کی آمد کے لیے مخصوص تھے اب ان کی رونق سمٹ کر ہندوستان کے شمالی دروں میں محدود ہو گئی تھی، وہ شاہراہیں جو ترکوں کی یلغاروں نے ہموار کی تھیں اب وہ ان درویشوں کی متواتر آمدورفت سے منور تھیں۔ کسی تاریخ کا قطعی تعین تو مشکل ہے۔ لیکن چوتھی ہجری کے وسط میں صوفیائے کرام نے کفرستان ہند کو اپنی جولانگاہ کا مرکز بنالیا تھا۔ یہاں کے متقدمین میں سرفہرست سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا نام ہے جن کے کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

خواجگان چشت:۔ لیکن بزرگان دین کا حقیقی اور منظم عمل خواجہ بزرگ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کی ہندوستان میں تشریف آوری سے شروع ہوا۔ آپؒ سلطان شہاب الدین غوری کی رائے پتھورا پر فتح یابی سے قبل یہاں تشریف لائے اور سلطان کی اجمیر پر فتح حاصل کرنے کے بعد مستقل اقامت یہیں اختیار کرلی۔ آپ ہی کی ذات گرامی سے خواجگان چشت کا وہ مشہور سلسلہ چلا جس نے ہندوستان میں ترویج دین۔ اشاعت اسلام اور تعلیمات قرآنی کی اشاعت کی بنیاد رکھ دی۔ آپ کے خلفائے نامدار میں وہ متبرک ہستیاں گذری ہیں کہ جن کے درویشانہ آستانوں پر شاہان وقت کی جبیں عقیدت خم ہوتی تھی۔ اگرچہ اس دور میں کہ با م بزرگان سلف کے کارناموں سے بشدت غفلت برتی جاتی ہے۔ بقول سید مناظر احسن صاحب گیلانی خواجگان چشت کا

نام زبان پر آتے ہی ذہن میں راگ رنگ اور سماع و قوالی کی محفلوں کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیری کے دو خلفائے کرام قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت حمید الدین ناگوری سرزمین ہند پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور نغمہ توحید کی آواز وہاں سے بلند کی جہاں مہادیو کی جے کے سوا اور کوئی صدا سنائی نہ دیتی تھی۔

آنجا کہ بود نعرہ فریاد مشرکاں

اکنوں خروش نعرہ۔ اللہ اکبر است

ان بزرگان کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ شاہان وقت ان کی خدمت کی خواہش کرتے اور یہ انکار کر دیتے تھے۔ سلطان التارکین حمید الدین ناگوری کے متعلق روایت ہے کہ بادشاہ وقت نے ان کی بزرگی اور درویشی کا شہرہ سن کر بطور مدد معاش کچھ اراضی اور زر نقد دینا چاہا۔ انہوں نے اس کا تذکرہ اپنی اہلیہ محترمہ سے کیا۔ وہ جواب میں فرماتی ہیں کہ "حضرت مجھے علم ہے کہ آپ کی لنگی بوسیدہ ہے اور میری اوڑھنی بھی پرانی ہے۔ لیکن میں نے دو سیر سوت کات رکھا ہے اس سے آپ کی لنگی اور میری اوڑھنی دونوں چیزیں بن جائیں گی۔ کیا ضرور ہے کہ آپ اپنے فقر کو شاہی امداد سے ملوث کریں"۔ ان بزرگوں کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ ان کی حرم محترم تک دنیاوی سہاروں کو حقیر جانتی تھیں اور از سر تا پا اس پر عمل تھا۔

مرا از شکستن چناں عار ناید

کہ از دیگراں خواستن مومیائی

انہوں نے یہاں اسلام کسی کرتب کے ذریعے نہیں پھیلایا بلکہ ان کی زندگی عملی طور سے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی کا نمونہ تھی۔ قرآن ان کے ورد زبان تھا۔ ان کے مرید جو حاضر دربار رہتے تھے ان کا ورد قرآن خوانی تھا۔ حفظ قرآن و تلاوت قرآن ان کا مشغلہ تھا۔ یہ اگر شاہی امداد قبول کرتے تھے تو اس کو غرباء پر صرف کر دیا کرتے تھے۔ ان کا یہی اخلاق تھا جس نے اشاعت اسلام کے لیے وہ زمین ہموار کی جو وقت کے ساتھ ساتھ نمونہ صد گلزار

جاں بن گئی۔ انہوں نے جس چمن کی آبیاری کی۔ اس میں ایسے ایسے گلہائے رنگا رنگ کھلے کہ ایک عالم کی نگاہیں ان کے حسن عالم آشوب کا شکار ہو گئیں۔ ان کی بارگاہ ولایت سے جو مرید تربیت پا کر نکلتا تھا وہ سراسر ان کے اخلاق کا نمونہ ہوتا تھا۔ اور جس سرزمین میں وہ پہنچتا تھا وہیں اپنے اعمال صالحہ اور پاک سیرت کے زور سے اسلام کی بنیاد رکھ دیتا تھا خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ کیمیا اثر نے ایک جوہر قابل کو تاکا جو فرید الدین گنج شکر کے نام سے مشہور ہوا اور اپنے زمانے کا شیخ کبیر ثابت ہوا۔ پنجاب کے ایک مقام پاکپتن میں انہوں نے قیام فرمایا۔ اور ملتان تک کے تمام علاقہ کو توحید کے رنگ میں رنگدیا۔ ان شیخ کبیر کی آغوش کا تربیت یافتہ ایک شاہین جس نے سرزمین دہلی کا انتخاب کیا اتنا بلند پرواز تھا کہ اولالعزمی کی تمام بلندیاں اس کی اڑان کے آگے ماند تھیں۔ عالم فقر میں دہلی کی سکونت اختیار کرنے والے خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور عروج میں اس مقام پر پہنچے کہ فرشتگان ملاء اعلیٰ تک ان کی آستاں بوسی کو عبادتوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اس رفیع المرتبت بزرگ کی خانقاہ سے ہزارہا افراد نے فیض و تربیت حاصل کی اور سرزمین ہند میں پھیل گئے اور یہاں کے گوشہ گوشہ کو قرآن پاک کی صدائے جاں نواز سے معمور کر دیا۔ اسلامی دنیا پر ان بزرگوں کے احسانات رہتی دنیا تک رہیں گے۔ کہ انہوں نے اشاعت اسلام کے لیے جو طریق کار اختیار کیا اور ترویج و حفظ قرآن کے لیے جو راستہ منتخب کیا، وہ اتنا دلنشیں، ایسا بلند اور پاکیزہ تھا کہ قرن اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ ان نفوس قدسی کی ارواح مقدسہ پر اللہ تعالیٰ کی ہزار ہا رحمتیں نازل ہوں کہ جو کام تخت و تاج کے وارثوں سے نہ بن آیا وہ ان کی کوششوں نے ممکن کر دکھایا۔ یہ تھا سلسلۂ خواجگان چشت اور یہ تھا ان کا طریقہ ترویج اسلام۔ ہندوستان میں تقریباً اڑھائی سو سال تک خواجگانِ چشت کا دریائے فیض رواں رہا۔ لیکن جیسا کہ زمانہ کا دستور ہے اسلامی ہند میں مسلمانوں کے سطوت و جلال کا نظارہ کرنے والی آنکھوں نے دور انحطاط کی کس مپرسی بھی دیکھی۔ دہلی کی مرکزی حکومت کے کمزور ہوتے ہی صوبیداروں نے الگ الگ صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور وہ شاندار نظامِ تعلیم و حیات جو

صوفیائے نامدار کی کوششوں سے معرض وجود میں آیا تھا صدیوں تک کے لیے مستقبل کے پردہ میں روپوش ہو گیا۔ ہندوستان کی سلطنت کا عروج تغلق خاندان پر ختم ہو گیا۔ لودھیوں نے اس منہدم بنیاد پر اپنی حکومت کا ایوان تیار کیا جسے بابر نے ایک ہی ضرب میں زمین بوس کر دیا۔ عجب اتفاق ہے کہ جب تک خواجگان چشت کا مربوط نظام فیض جاری رہا۔ حکومت و سلطنت پر بھی عروج رہا۔ جب ان بزرگان کی مرکزیت اور سلسلہ فیض ختم ہوا سلطنت کی سطوت نے بھی دم توڑ دیا اور اب وہ دنیا ویران پڑی تھی جہاں التمش، بلبن، خلجی اور تغلق جیسے فرمانرواؤں نے اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ وہ خانقاہیں اور مدرسے خاموش تھے جہاں سے ہر وقت قرآن حکیم کی آواز گونجتی تھی۔ ان تربیت گاہوں پر سناٹا تھا جو شاہ و گدا سب کے لیے یکساں طور پر مرکز امید تھیں اور جہاں سے تربیت پانے والے نیک نہاد افراد نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر ایک شاندار اسلامی عہد کی پائیدار بنیاد رکھی تھی۔

اکبری دور: بابر اور ہمایوں کا عہد سلطنت رواداری کا تھا۔ جو سرزمین ہند پر ابر کی طرح چھایا اور بارش کی طرح برس کر ختم ہو گیا۔ بابر کی قائم کردہ بنیاد پر اکبر اعظم نے قصر حکومت تیار کیا البتہ وہ ایسا تھا کہ تین سو سال تک زمانہ کی گردشیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے جلال الدین اکبر چودہ سال کی عمر میں تخت نشیں ہوا۔ چار سال تک خانخاناں کے زیر اثر رہا اس اثر سے آزاد ہوا تو ہر طرف فتوحات کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ اور یہ ننھا سا ستارہ ابتداء میں جس کی روشنی نگاہوں میں نہ جچتی تھی دیکھتے ہی دیکھتے آفتاب عالم تاب کی تابانی اختیار کر گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مغل اعظم کی حکومت کا سکہ ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت میں بیٹھ گیا۔ اکبر ابتداء میں مذہبی اعتبار سے ایک سیدھا سادھا مغل بچہ تھا۔ اس کی خوش اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا۔ بزرگان دین کے مزارات پر پاپیادہ حاضری دیتا۔ علماء و مشائخ کی جوتیاں سیدھی کرتا اور ان کی خدمت کو سعادت دین و دنیا اور فلاح دارین کا سبب جانتا۔ لیکن

دنیا ان نیک نفس بزرگوں کے وجود سے خالی ہو چکی تھی۔ جنھوں نے اپنی روحانی فرمانروائی کے نقش ہندوستان میں قائم کیے تھے۔ ان کے مسند نشیں اور وارث وہ لوگ تھے جن کو خدمت دین سے زیادہ دولتِ دنیا کی ہوس تھی۔ ایثار و اخلاص، نفس کشی بے غرضی کی داستانیں اب بوسیدہ اوراق کی زینت تھیں۔ اکبر بادشاہ کے قریب وہ لوگ جمع تھے جن کا چلن اپنے پیش روؤں سے قطعی مختلف تھا۔ یہ عالم دیکھ کر شہنشاہ ہند کا دل ان اجارہ داران مذہب سے بھر گیا اور وہ سیدھا سادھا مسلمان مذہب فروش علماء اور دنیا دار مشائخ کی کج بحثیوں سے تنگ آکر تشکیک و الحاد کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ فیضی اور ابوالفضل کی فلسفیانہ موشگافیوں نے بادشاہ کی بے اعتقادی پر اور گہرا رنگ چڑھایا۔ شاہی سرپرستی میں مشرکانہ رسم و رواج اور ملحدانہ طور و طریق فروغ پانے لگے۔ علماء مشائخ کا زور ختم ہو گیا۔ برہمنوں پنڈتوں اور مذہبی شعبدہ بازوں کا رنگ جمنے لگا۔ اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ کو امام وقت کا درجہ مل گیا۔ اور مسائل شریعت سیاسی مصلحت کے تحت طے ہونے لگے۔ مسجدوں میں جھاڑو دینے خود اذان کہنے والے بادشاہ وقت کو جب تخت سلطنت پر قشقہ لگائے راجپوتی کھڑی دار پگڑی باندھے اور ہولی، دیوالی دسہرہ کی مجلسوں کی رونق بنتے دیکھا تو عبرت کی آنکھوں سے خون کے آنسو نکل پڑے اور اسلامی ہند کے محضرِ تقدیر پر آخری مہر اس وقت لگی جب بادشاہ نے اپنی سرپرستی میں دین الٰہی اکبر شاہی کو فروغ دینا شروع کیا۔

سلسلہ قادریہ:- چشتیہ اکابرین کے گذر جانے کے بعد ان کے جانشینوں نے واقعتاً ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جن سے تصوف اور صوفیائے کرام کے ساتھ بدظنی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ چند ایک رسوم نے ان کی مجالس میں وہ دخل پا لیا تھا کہ ان کو عبادت کا درجہ مل گیا تھا۔ اعتقادات میں خرافات کا ایک طوفان شامل ہو چکا تھا۔ سماع قوالی اور راگ رنگ کی رنگینی حال و قال کی مجلسوں پر چھا چکی تھی۔ غرضیکہ خواجگان چشت کی تعلیمات کا جو مقصد و مدعا تھا اس دور میں سراسر اسکے

خلاف ہو رہا تھا۔ وحدۃ الوجود کا مسئلہ جو یقیناً اپنے وقت کیلئے مفید تھا آج دین اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کیے دے رہا تھا۔ ہندی وید کے بنیادی اصول دین اسلام جیسے بے لچک قانون میں داخل کیئے جا رہے تھے۔ غرضیکہ ہر طرف ایک افراتفری کی کیفیت تھی۔ لیکن قدرت ان حالات سے ناواقف نہیں تھی۔ جو زہر آگیں فضا یہاں پیدا ہو گئی تھی اس کا تریاق بھی مہیا ہو رہا تھا جس عالم میں شریعت محمدیؐ اور دین مصطفوی کی حفاظت کیلئے سلسلہ قادریہ کے بزرگوں نے جدوجہد شروع کی۔ وہ دور سخت ابتلاء و آزمائش کا دور تھا۔ اور بزرگان سلسلہ قادریہ نے جسطرح اس دور کا مقابلہ کیا وہ قابل صد ہزار داد و تحسین ہے۔

یہ نامناسب نہ ہو گا کہ ان اوراق میں سلسلہ قادریہ کے بزرگان کا تعارف بھی کرا دیا جائے۔

حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مشائخ کبار میں سید عبدالقادر جیلانیؓ کا جو درجہ ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ آپؓ اپنے وقت کے امام تھے۔ آپؓ نے طویل عمر پائی تھی۔ اور عمرِ عزیز کا ہر لمحہ دین اسلام کی رونق افزائی میں صرف کیا تھا زمانہ نے بھی آپکی قدر شناسی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور آپؓ کو وہ خطاب عطا کیا جس کے وہؓ ہر طرح مستحق تھے۔ دین کو نئے سرے سے زندہ کرنے والے نے وقت کی بارگاہ سے محی الدین کا لقب حاصل کیا آپؓ کی پیدائش کا سال ۴۷۱ھ ہے اور وفات ۵۶۱ھ ہے۔ اس طویل زمانہ میں آپؓ کا زیادہ تر قیام بغداد میں رہا۔ ملک و ملت اور دین و مذہب کی خدمت آپؓ نے ہر رنگ میں کی۔ اپنی اولاد خلفاء اور مریدوں کی اپنے مخصوص رنگ میں تربیت فرمائی جو مختلف اوقات میں اقطاع عالم میں پھیلتے گئے۔ اور اس امام وقت کے مقصد حیات کو فروغ دیتے رہے بلکہ آپؓ کے بعض تربیت یافتگان تو اسقدر نامور ہوئے کہ بذات خود علیحدہ سلسلہ ہائے تصوف کے بانی بنے۔ جیسے کہ خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ سلسلہ سہروردیہ کے اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ چشتیہ سلسلہ کے موسس اور بانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو اولاد بھی کثرت سے عطا

فراہم تھی جو مشرق وسطیٰ کے اکثر حصوں میں آپکا نام نامی روشن کرنے کا باعث ہوئی۔ سلسلہ قادریہ کی ابتداء حضرت سیدنا سید عبدالقادر جیلانیؒ سے ہوئی۔ ہندوستان میں جس وقت تشکیک و الحاد بے دینی اور بدعت کو فروغ ہو رہا تھا۔ اس سلسلہ کے بزرگ عین اس وقت تشریف لائے اور ہندوستان کے مختلف ظلمت کدوں میں چراغ ہدایت جلا کر بیٹھ گئے۔ ایک طرف اگر دین میں رخنہ اندازی ہو رہی تھی تو دوسری طرف اس در اندازی کا علاج بھی ہو رہا تھا

ہوا تھی گو تند و تیز چراغ اپنا جلا رہے تھے
وہ مرد درویش جن کو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ

الحاد و بے یقینی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ کفر و طغیان کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ مگر یہ اللہ کے بندے مصلحت وقت سے بے پرواز مانہ کے اشاروں سے ناآشنا اپنی دھن میں مگن اور اپنے کام میں مصروف تھے۔ یہ لوگ مسند فقر پر بیٹھے اورنگ شاہی کا مذاق اڑا رہے تھے۔ سلسلہ قادریہ کے بزرگ شرعی امور کے زیادہ سے زیادہ پابند اور دینی معاملات میں زیادہ سخت تھے۔ کیونکہ قدرت نے اس دور کی اصلاح اس طبقہ عالیہ کے سپرد کی تھی۔ اسلئے یہ بزرگ ان تمام صفات سے آراستہ و پیراستہ تھے جن سے دین محمدی کی رونق و ترویج میں معاونت ہو سکتی تھی۔ راگ رنگ اور سماع و مزامیر کی تمام بد عنوانیوں سے یہ مشائخ مبرا تھے۔ جو قرون اول کے مسلمانوں کا طرہ امتیاز تھیں۔

انہوں نے احیائے رسوم اور کلمۃ الحق کی سربلندی کیلئے جو کارنامے سرانجام دیے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے عین اس وقت جبکہ شمع توحید کو بجھانے کی مذموم کوششیں کی جارہی تھیں اور دشمنان اسلام دین حق کو مٹانے کیلئے اپنی تمام قوتیں میدان عمل میں لے آئے تھے ان پاکیزہ ہستیوں نے اپنی اصلاح و ہدایت سے سرزمین ہندوستان کو نور اسلام سے جگمگا ڈالا اور دریائے سرستی کے کنارے کیتھل سے ایسا تبلیغی نظام قائم کیا جس سے ہزاروں بت پرست جادوگر اور جوگی حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اچ شریف میں سید عبدالقادر ثانیؒ، شیر گڑھ میں شیخ جلال الدینؒ

تھانیسری اور کیتھل میں حضرت شاہ کمال کیتھلی اور حضرت شاہ سکندر محبوب الٰہی جیسے قادری سلسلہ کے بزرگان عظام اپنے کام میں مصروف تھے۔ لیکن اس دور بدعت والحاد کے طلسم کے توڑنے کیلئے جس مرد جلیل اور بطل عظیم کی ضرورت تھی وہ ابھی تک پردۂ خفا میں مستور تھا۔ زمانہ ساکت وصامت اس ہستی بزرگ کی آمد کا منتظر تھا۔ قدرت نے جس کے سر پر اس زمانہ کی دینی رہنمائی کا تاج رکھنا تھا۔

"قریب تر تھی نمود جسکی اسی کا تھا منتظر زمانہ"

وہ مرد مومن جس نے آگے چل کر ہندوستان کی علمی شرعی، ذہنی و فکری دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اس کی تربیت کیلئے سامان مہیا ہو رہے تھے۔ چاروں طرف سے مقدس ہستیاں جمع ہو کر اس جہان نو کی تشکیل و تعمیر کی تدبیریں کر رہی تھیں جو چشم عالم کیلئے نگاہ خیرہ کن بننے والا تھا۔ وہ ہستی اعلیٰ جس طرف ان سطور میں اشارہ ہے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے یہی وہ مرد مجاہد تھا جس نے اسلامی ہند کے ذہنی جمود اور روحانی پستی پر وہ ضرب گراں لگائی کہ غفلت و ظلمت کے آسماں بوس پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑ گئے۔ اور جسکی آواز صور اسرافیل کی مانند چاروانگ عالم میں گونج اٹھی۔ وہ دنیا جو ایک خواب غفلت میں مدہوش تھی چونک کر بیدار ہو گئی

سرہند:- وہ شاہراہ قدیم جو ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک ریڑھ کی ہڈی کیطرح پھیلی ہوئی تھی جسے شاہراہ شیر شاہ کہا جاتا ہے اس کے کنارے سب سے مشہور و معروف شہر و قصبات ہیں جو دنیا میں مختلف خصوصیات کے باعث مشہور ہوئے۔ مگر سرہند کے سر پر قدرت نے جو تاج مجدد شرف رکھا وہ اس شاہراہ کیلئے بھی تا قیامت باعث فخر و مباہات رہیگا۔ وادی ستلج میں واقع یہ قصبہ اب مشرقی پنجاب کی ریاست پٹیالہ کی زینت ہے۔ اس کا قدیم نام سہرند ہے۔ جسکی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ یہاں جنگلات تھے جن میں درندوں کا مسکن تھا لیکن مرور زمانہ کے ساتھ سہرند نے سرہند کا قالب اختیار کر لیا۔ یہی غیر معروف سا قصبہ تھا جس کے افق پر وہ آفتاب طلوع ہوا جس نے ہندوستان کی ظلمتِ الحاد کو بدل کر مشرف بہ اسلام کر دیا۔ اسی قصبہ کے متعلق پانچ سو سال قبل

خواب محبوب سبحانی غوث صمدانی حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ نے بشارت دی تھی کہ یہاں ایک نور پیدا ہو گا جو دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تجدید کریگا۔

شیخ عبدالاحد سرہندیؒ :- اس قصبہ سرہند میں کابل سے ہجرت کر کے شیوخ فاروقی کا ایک خاندان آباد ہوا۔ جس کے ایک معتدر فرد شیخ عبدالاحدؒ اپنے وقت کے نہایت ہی نیک نہاد اور پاکیزہ فطرت انسان تھے۔ اس زمانے کے عالی فطرت انسانوں کی مانند یہ مرد بزرگ بھی روحانیت کے اعلیٰ ترین مناسب پر فائز اور مزید روحانی ترقیوں کے طلبگار تھے۔ سلسلہ چشتیہ میں ان کی بیعت خواجہ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے تھی جو حقیقتاً اپنے وقت کے قطب الاقطاب اور امام زماں تھے شیخ جلال الدین تھانیسریؒ جو کہ حضرت گنگوہیؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے ان کے ساتھ بھی شیخ عبدالاحد سرہندیؒ کو ایک روحانی مناسبت اور دلی لگاؤ تھا۔ اکثر تھانیسر میں جو کہ جناب شیخ کی اقامت گاہ تھی آپ کا ورود و قیام رہتا تھا۔ یہیں سے ایک اور منبع انوار کی جانب قدرت نے آپ کی رہنمائی فرمائی اور شیخ عبدالاحدؒ کی ملاقات سلسلہ قادریہ کے ایک رکن اعظم اور اپنے وقت کے ابدال سے ہوئی جن کا نام نامی اور اسم گرامی آئندہ چل کر عروس البلاد علم اور فخر ہفت اقلیم بننے والا تھا، کبیر ملک العشاق شیخ الآفاق حضرت شاہ کمال قادری کیتھلیؒ تھا۔ شیخ عبدالاحد چند ملاقاتوں کے بعد اعلیٰحضرت شاہ کمالؒ کے کمالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سلسلہ قادریہ میں آپؒ سے بیعت کی (حالات زندگی مجددین سلسلہ قادریہ میں علیحدہ درج ہیں)

آپؒ ہی نے شیخ احمد سرہندی کی پیدائش کے متعلق بشارت دی۔ جو خواب شیخ عبدالاحدؒ نے دیکھا تھا۔ اسکی تعبیر حضرت شیخؒ نے بیان فرمائی چنانچہ کیتھل میں کہ جہاں اعلیٰحضرت شاہ کمالؒ نے مستقل اقامت اختیار فرمائی تھی۔ وہاں شیخ عبدالاحدؒ اس نونہال چمنستان اسلام کو ساتھ لیکر حضرت کبیر ملک العشاق کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور یہیں سے شیخ احمد کے دل میں سلسلہ قادریہ کی عظمت کی شمع روشن ہوئی۔ اور اعلیٰحضرتؒ کے وصال کے بعد آپؒ کے نامور

جانشین حضرت رؤس الاولیاء شاہ عبداللہ سکندر رؤس ؒ سے بیعت کی ۔ اور اس مقام محمود تک رسائی حاصل کی ۔ جو ان کا منتہائے مقصود تھا ۔ (مجددین سلسلہ قادریہ میں حضرت رؤس الاولیاء کے حالات مندرج ہیں) ان دونوں حضرات کے مزارات تقسیم ہند کے بعد عالم کس مپرسی میں تھے ۔ لیکن قدرت نے ایک ہندو اہل دل کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ اس نے ۱۹۶۰ء میں مزارات کی تولیت حاصل کر لی اور دونوں مزارات کی تزئین و آرائش اس ذوق و شوق اور سلیقہ سے کی کہ کسی اور سے ممکن نہ تھی ۔ یعنی

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

اب وہاں ان حضرات کے مزارات پر خلق خدا کا ہجوم رہتا ہے ۔ اور مارچ کے مہینے میں بڑے پیمانے پر عرس کا اہتمام ہوتا ہے ۔ سچ کہا ہے کسی اہل دل نے کہ

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

کیتھل کے حالات الگ "بستان کیتھل" کے نام سے مرتب کئے گئے ہیں ۔ عرس کے موقع پر تین مرتبہ ڈیرہ غازیخاں سے سید مقبول محی الدین سلمہ اور ان کے تینوں صاحبزادے جا چکے ہیں اور وہاں سے بہت مطمئن اور خوش و خرم آئے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ بلا امتیاز مذہب و ملت ہر قوم کے افراد وہاں پر آکر سکون و اطمینان کی دولت حاصل کرتے ہیں اور والہانہ طور پر مزارات پر عقیدت و محبت کے پھول چڑھاتے ہیں ۔ ان مزارات پر کیا ہندو اور کیا سکھ سب ہی آتے ہیں ۔ اکثر ہندو شادی سے پہلے دولہا کو مزار پر سلامی کیلئے لاتے ہیں ۔ ہندو بھی ان ؒ پر اتنا ہی اعتقاد کرتے ہیں جتنا مسلمان ۔ سچ ہے جو کام حکمران نہ کر سکے وہ ان پاکیزہ ہستیوں نے انجام دیا ۔ اس میں شک نہیں کہ عام انسان اپنے حاکموں کے طریقہ پر چلتا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام کے دلوں پر حکمرانی کرنے والے یہی لوگ تھے جن کے آستانوں پر آج بھی عقیدت اور محبت سے لوگ سر جھکاتے ہیں ۔

سلسلہ عالیہ قادریہ کا وہ عظیم الشان کارنامہ جو آگے چل کر اکبری الحاد کے لیے سد سکندری ثابت ہوا ایسے بزرگوں کی تربیت اور نگاہ داری ہے۔ جو اس نازک وقت میں اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ اور سفینۂ ملت کو اس دور کے خوفناک طوفان بلا سے صاف بچالے گئے سلسلہ قادریہ کی یہ شاخ جسے قادریہ مجددیہ کہنا چاہیے۔ اور جس کی آغوش تربیت سے شیخ عبد الاحد سرھندی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور شیخ طاہر بندگی لاہوری جیسے بلند مرتبت بزرگ پرورش پا کر نکلے میرا خیال ہے کہ خدمت دین کے لحاظ سے تمام خانوادہ ہائے تصوف پر فوقیت رکھتی ہے۔

سلسلہ قادریہ کی اس شاخ کے بانی حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رحمۃ الیہ علیہ ہیں۔ جن کے حالات اور کارناموں کے متعلق اکثر تذکرہ نگاروں نے غفلت برتی ہے۔ اگر کہیں ان کا اور ان کے نامور جانشین حضرت شاہ سکندر قادری روس الاولیا۔ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آیا ہے۔ تو وہ چند سطروں سے زیادہ نہیں۔ حالانکہ یہ وہ بزرگ ہیں کہ جن کی ذات گرامی نے سلسلہ قادریہ مجددیہ کی بنیاد رکھی۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ ان بزرگوں کے حالات زندگی اور کارنامے وضاحت سے بیان کیے جاتے۔ لیکن خدا جانے وہ کیا اسباب تھے کہ تذکرہ نگار اس باب میں خاموش رہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے آپ کے قلب کو آفتاب درخشاں فرمایا۔ کیونکہ آفتاب اپنی روشنی اور چمک ہی میں چھپا ہوتا ہے۔ آنکھ نہ آفتاب کی بلندی کا اندازہ کر سکتی ہے اور نہ اس کی جسامت کا۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے تو تاریک رات چلی جاتی ہے۔ اور روشن دن آجاتا ہے۔ آپ کی تربیت اور تعلیمات سے خیر و شر۔ نیکی اور بدی کی قوتوں میں نمایاں فرق پیدا ہوا۔ دین الٰہی اکبر شاہی کی تاریک رات دور ہوئی اور حق کی روشنی سے اجالا ہوا۔ اخبار الاخیار جو ایک معاصرانہ تصنیف ہے۔ بڑی حیرت ہے کہ اس کتاب کے نیک نہاد مصنف بھی ان بزرگوں کے بارہ میں خاموش ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی خاموشی اور ان بزرگوں کی طرف سے لاپرواہی شاید اسی سبب سے ہو کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے برگشتہ خاطر تھے۔ اور اس کبیدگی طبع کے باعث ان حضرات کی طرف سے بھی اغماض برت گئے۔ بہر حال آئندہ اوراق اسی کوتاہی کی تلافی کے لیے وقف ہیں۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ

مفصل طریق سے ان ہر دو ناموران سلسلہ عالیہ قادریہ کے حالات بیان کیے جائیں۔

شیخ الآفاق حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ

جیسا کہ اوراق ماسبق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت پیر محبوب سبحانی سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان کی تعداد گیارہ تھی۔ آٹھویں صاحبزادہ کا نام عبدالرحمان عبداللہ تھا جو اپنے گرامی قدر پدر بزرگوار کی آغوش تربیت کے پروردش یافتہ تھے۔ اور علم و فضل کی دنیا کے بدر کامل تھے۔ ان کی تیرھویں پشت میں حضرت شاہ کمال کیتھلی پیدا ہوئے۔

سلسلہ نسب

(۱) شاہ کمال کیتھلیؒ (۲) بن سید حاجی عمرؒ (۳) بن حاجی عثمانؒ (۴) بن سید عیسےٰ حسنیؒ (۵) بن سید موسیٰ ثانیؒ (۶) بن سید یوسفؒ (۷) بن سید جمال علیؒ (۸) بن سید نورالدینؒ (۹) بن سید ابراہیم (۱۰) بن سید نظام الدینؒ (۱۱) بن ابو محمد عبدالقادر حادیؒ (۱۲) بن سید عبدالرحمان ثانیؒ (۱۳) بن سید عبدالرحمان عبداللہؒ (۱۴) بن سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت محبوب سبحانی سیدنا عبدالقادر جیلانی کی وفات ۵۶۱ ہجری میں ہوئی۔ شوکت اسلام کی رونق جس کی افسردگی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ آپ کی وفات سے قبل ہی پھر سے بحال ہو چکی تھی۔ جہاد قومی کی بنیاد آپ کے ہاتھوں رکھی گئی اس کی تکمیل سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۸ھ میں

حاشیہ نمبر ۱۳:- حضرت سید عبدالرحمانؒ قدس سرہ نے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل اپنے والد گرامی سے کی۔ آپ اپنے وقت کے عالم و فاضل اور فقیہ تھے۔ ۲۷ صفر ۵۸۷ھ میں انتقال فرمایا۔ مرقد بغداد میں زیارت گاہ خلق ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے قطعہ تاریخ وفات

قطعہ تاریخ وفات:- چو از دنیا بجنت گشت راہی | شہ اہل یقیں مقبول رحماں
وصالش وائی تسلیم پیداست | دوبارہ "مہ جبیں مقبول اش"

۵۸۷ ۵۸۷

بیت المقدس کی فتح سے کردی۔ لیکن ملت اسلامیہ کی یہ آخری انگڑائی تھی۔ سلطان ایوبی کی وفات کے بعد پھر سے غفلت کے بادل چھانے لگے۔ تا آنکہ قدرت نے اپنا قانون جاری کیا۔ اور مسلمانوں کو غفلت کوشی کی سزا ملنے لگی۔ بلاد اسلامیہ کے شمال مشرق سے تاتاریوں نے سر نکالا اور ذرا سی مدت میں بلاد اسلامیہ کو برباد و ویران کر کے رکھ دیا۔ تاتاری حملوں کی ابتداء ۶۱۵ھ میں ہوئی۔ اور ۶۵۶ھ میں سقوط بغداد پر منتج ہوئی۔ عالم اسلام کی یہ تباہی ایسی تھی کہ شاید چشم فلک بھی اس پر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکی ہو۔ فضل و کمال کے وہ مراکز جہاں سے شب و روز نور علم کی شعاعیں پھوٹتی تھیں ویران ہو گئے۔ وہ خانقاہیں جو منزل سلوک و تصوف کے متلاشیوں کا ملجا و ماوی تھیں اب ھو حق کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ اس عالم دارو گیر میں۔ بہت سے خاندان بغداد سے ہجرت کر گئے۔ انہیں ہجرت کرنے والوں میں جناب سید عبدالرحمان عبداللہ ؒ (حضرت پیران پیر دستگیر کے آٹھویں صاحبزادے) کا خاندان بھی تھا۔ اس خاندان نے بغداد سے ہجرت کر کے کوفہ میں قیام کیا۔

بندگان خدا اور درویشان حق آگاہ کا عمل ہمیشہ "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کے اصول پر رہا ہے۔ جہاں گئے فضل و کمال کی روشنی اپنے ہمراہ لے گئے۔ صورت آفتاب مغرب میں غروب ہوئے تو مشرق میں جا نمودار ہوئے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں۔
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس گرامی قدر خانوادہ کو کوفہ میں توطن اختیار کیے اڑھائی صدیاں گذری تھیں کہ اس گھرانے سے وہ آفتاب ولایت طلوع ہوا کہ جس نے آئندہ چل کر بلاد ہند کو انوار سے منور کرنا تھا۔ یہ اعلیٰحضرت شاہ کمال قادری تھے جن کی ولادت باسعادت ۸۹۵ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم نے آپ کا نام شاہ کمال رکھا۔ جو بلاشبہ اسم بامسمیٰ ثابت ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قدرت نے ولایت فضل و کمال کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا۔ سن تمیز کو پہنچے تو خاندانی دستور کے مطابق آپ

کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی۔ آپ کے بچپن کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے والد اور چچا کسی دقیق مسئلہ پر محو گفتگو تھے کہ شاہ کمال ان کے قریب پہنچے اور ان کی گفتگو سننے لگے۔ اس وقت آپ کی عمر بمشکل آٹھ برس تھی۔ آپ نے کہا کہ اگر حدیث کے احوال حدیث والے سے نہیں پوچھ سکتے تو محض بے جان لفظوں کی تکرار سے کیا فائدہ۔

کوئی علم و فضل کا منتظر تھا۔ اور آپ میں حصول علم کی استعداد فطری۔ بہت جلد آپ نے اس منزل کو طے کر لیا۔ لیکن جوں جوں آپ کی عمر بڑھتی جاتی تھی۔ طبیعت پر جوش و شوق کا غلبہ زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ سعید روحیں جن سے خالق کائنات نے اس کاروبار عالم میں کوئی بڑا کام لینا ہوتا ہے ابتدا ہی سے ان میں ایسے آثار پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں جو عقل کی نگاہ میں تو غیر معمولی ہوتے ہیں لیکن دنیائے عشق و محبت میں عین صواب سمجھے جاتے ہیں انہیں کتابوں کے مطالعہ سے زیادہ صحیفہ فطرت پر غور کرنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ قید علائق کی زنجیریں ناگوار گذرتی ہیں۔ اور جب جوش جنوں کی فراوانی ہوتی ہے۔ یہ زنجیروں کو توڑ کر بیاباں نوردی اختیار کر لیتے ہیں۔ حسن ازل کی صحیح کیفیات جیسی کچھ سکوت و سکون کے عالم میں انسان کے دل پر عکس ریز ہوتی ہیں وہ آبادیوں کے ہنگامہ میں میسر نہیں آسکتیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ ابھی آپ نے عمر کے پندرھویں سال ہی میں قدم رکھا تھا کہ "ارنی" گوئے طور کی مانند حسنِ محبوب کی جھلک دیکھنے کے لیے ذوق و شوق نے دل میں طوفاں انگیزی شروع کر دی۔ چشم حق بیں میں جب یہ جلوہ سما جاتے تو پھر فانی دنیا کی ہر کشش بے اثر ہو جاتی ہے۔ خونی تعلق، احباب کی محبت، آسائش و راحت کے سامان کوئی چیز بھی دامنگیر نہیں ہوتی۔ دنیائے دوں کی راحتیں اور تعلقات بھی کچھ کم کشش انگیز نہیں۔ قدم قدم پر دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ لیکن کتنا عظیم اُس دل کا ظرف ہے جو ان سب کو بیک وقت ٹھکرا دے۔ اور ان کی کشش انگیزی کی ہر کیفیت کو بے اثر بنا دے۔ کچھ یہی کیفیت اس سالار خانوادہ قادریہ کی تھی کہ گھر سے نکلتے تو کئی کئی دن تک آبادیوں کی طرف رخ نہ کرتے۔ اور راہ عشق میں قدم زن ہوتے تو ٹھہرنے کا نام نہ لیتے۔ نہ کھانے کا ہوش رہتا نہ لباس کی پرواہ ہوتی۔ موسم کے شدائد سے

بے پرواہ۔ آبلہ پائی کے مزے لیتے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں پھرا کرتے روایت ہے کہ آپ کے والد محترم اپنے نور نظر کی اس کیفیت سے ابتدا میں انتہا درجہ پریشان ہوتے۔ جب یہ باہر نکل جاتے تو ساتھ لے آیا کرتے۔ مگر جب ان پر ذوق وشوق کا غلبہ زیادہ ہوا تو دور دور نکلنے لگے۔ اور علائق دنیوی سے قطعی آزاد ہو گئے۔ پدر بزرگوار اور مادر مہربان کے لئے صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کبھی ان پر جوش جنوں کا غلبہ کم ہوا تو گھر میں قدم رکھ لیا۔ ورنہ وہی صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی جاری رہتی۔

خوان ازل:- زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ "حضرت شاہ کمال شوریدگی اور آشفتہ سری سے اکثر جزائر و دشت و بیاباں میں پھرا کرتے تھے۔ جہاں دانہ پانی نام کو نہ ہوتا۔ جب کھانے پینے کی احتیاج ہوتی تو یہ ایک جگہ پر لیٹ جاتے اور وہاں بستی ظاہر ہو جاتی۔ وہاں کے لوگ بہ تعظیم و تکریم آپ کو آکر لے جاتے۔ اور دعوت کرتے اور بمصداق ابیت عند ربی آپ کھانا کھلاتے۔ صبح جب آپ نیند سے اٹھتے تو وہاں نہ شہر ہوتا۔ نہ بستی ہوتی اور نہ لوگوں کا نام و نشان"۔

سبحان اللہ! جو اس دنیائے ناپائیدار سے منہ موڑ لیں۔ علائق دنیوی سے رشتہ توڑ لیں پھر خوان ازل سے کس کس طرح ان کی تواضع ہوتی ہے۔

حضرت شاہ فضیل قادری سے بیعت:- اعلحضرت کا یہ جذب دروں جب انتہا کو پہنچ گیا اور استاد ازل نے جب اچھی طرح سے پرکھ لیا۔ کہ اس دل میں سوائے حسن لم یزلی کے اور کسی خیال کی گنجائش نہیں رہی۔ نہ اس پر فطری محبت غالب آ سکتی ہے۔ اور نہ دنیوی علائق اس کے پاؤں کی زنجیریں بن سکتے ہیں۔ اس کی طبیعت اور مزاج اک خاص سانچہ میں ڈھل گیے ہیں۔ جن بلند مقاصد کے لیے قدرت کو آپ کی تربیت مقصود تھی۔ جب دیکھ لیا کہ ان کی استعداد مکمل ہو چکی ہے تو اس عالم وارفتگی اور شوریدگی میں ہوش کا جلوہ نمودار ہونے لگا۔ یہ کیفیت ایک مرشد کی طلب کرتی ہے۔ جب طبیعت اس طرف مائل ہوئی تو آپ کے لیے یہ راہیں بھی کشادہ ہو گئیں۔ چنانچہ زبدۃ

المقامات میں مرقوم ہے کہ " آپ نے اویسی طریقہ پر پہلے حضرت سید نا عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ
علیہ کی روح پر فتوح سے بیعت کی۔ اور محبوبان اویس المشرب میں شمار ہوتے۔ لیکن ظاہری طور پر
بھی کسی مرشد کامل سے بیعت ضروری تھی۔ چنانچہ اس وقت کے شیخ کامل حضرت شاہ فضیل
قادریؒ جو سلسلہ، قادریہ کے بدر کامل تھے۔ آپ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور یوں یہ بیعت
ظاہری کا سلسلہ بھی مکمل ہوگیا۔ روایت ہے کہ جب حضرت شاہ کمال جناب شاہ فضیل کی خدمت
میں حاضر ہوئے تو ان کو دیکھتے ہی بے ساختہ پکار اٹھے شاہبازے بچنگ ما افتادہ است

سلسلہ مرشدی

حضرت شاہ فضیل قادریؒ کا سلسلہ نو واسطوں سے شیخ الجن والانس حضرت سید عبد القادر
جیلانی سے ملتا ہے جو اس طرح سے ہے۔ مخدوم شاہ فضیلؒ۔ سید گدا رحمان ثانیؒ۔ سید شمس الدین
عارفؒ۔ سید گدا رحمان اولؒ۔ سید شمس الدین صحرائیؒ۔ سید عقیلؒ۔ سید بہاء الدینؒ۔ سید عبد الوہابؒ۔ سید
شرف الدینؒ۔ سید عبد الرزاقؒ۔ غوث الثقلین حضرت محبوب سبحانی رحمتہ اللہ علیہ۔

حضرت شاہ فضیل قادریؒ سے بیعت کے بعد جوش و شوق کے بحر ذخار اور بحر ناپید اکنار پر
گویا بند لگ گیا۔ اور اب وہ وارفتگی اور آشفتگی اعلیٰ مقاصد کے راستوں میں استعمال ہونے لگی۔ اور
دنیوی تعلقات کہ جن سے طبیعت نفور تھی۔ اب وہ کسی اور رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ وحشت جو
ابتداء میں طبیعت پر غالب تھی۔ انس و محبت میں تبدیل ہو گئی والدین اور دیگر اعزہ و احباب سے
میل جول میں وہ مغایرت نہ رہی۔ چنانچہ عم بزرگوار حاجی سید مرتضےٰ کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح
کر دیا گیا۔ جس کے بعد آپ ایک طویل سیاحت کے لیے چل نکلے۔ حدیقتہ الخوارق جو آپ کے
احوال و مقامات پر مشتمل تذکرہ ہے اور جسے آپ کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد ہی شیخ حبیب اللہ
سرہندی نے مرتب کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنت نبویؐ کی تکمیل یعنی نکاح سے

فراغت کے بعد سیاحت کے لیے گھر سے چل نکلے۔

سیر الارض

چونکہ مقامات سلوک میں یہ منزل بھی اہم مقام رکھتی ہے۔

"السیر فی الارض" کے فرمان واجب الاذعان کی تکمیل کے بغیر انسانی شخصیت کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے سرزمین حجاز کا سفر اختیار کیا۔ اور فریضہ حج سے فراغت حاصل کی۔ بعد ازاں بلاد شام و ترکیہ اور ارض فلسطین کی سیاحت سے دیدہ و دل کے لیے روشنی مہیا کی۔ اس سفر کے دوران میں بے شمار واقعات سے آپ دوچار ہوئے۔

روایت ہے کہ حضرت شاہ کمال قادری جب آگرہ تشریف لے گئے۔

تو وہاں آپ سید حامد کے مہمان تھے۔ آپ سے وہیں ملاقات کے لیے شیخ مبارک آئے۔ دوران ملاقات دعا اور پند و نصیحت کے لیے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا بادشاہوں کی قربت سے دور رہنا۔ اور مفاد و معاش کے لیے ان کے در پر نہ جانا۔ اس واقعہ سے آپ کی مومنانہ فراست اور نگاہ دور بین کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حدیث نبویؐ ہے کہ " مومن کی فراست سے ڈرو۔ کہ وہ نور باطن سے دیکھتا ہے"

کسی نے سید غوث علیؒ شاہ سے دریافت کیا کہ علاء الدین صابر کلیری حضرت شاہ کمال کیتھلی اور بو علی قلندر پانی پتی کس مقام پر فائز تھے۔ آپ نے فرمایا کہ صابر کلیری اور حضرت شاہ کمال سیر جہاں میں مصروف تھے۔ اور بو علی قلندر سیر جان میں۔ یہ تینوں بزرگ ہر وقت دریائے حیرت میں غرق رہتے تھے۔

بہت سے فاضلان عصر اور ناموران زمانہ سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ اہل اللہ اور فقراء کی صحبتوں سے لطف اٹھایا۔ اور مقامات مقدسہ کی زیارت سے متاع روحانیت حاصل کی۔ تاریخ اسلام کے آثار و شواہد کا مشاہدہ کیا۔ اس گراں بہا سرمایہ کے ساتھ جب آپ وطن مالوف کو لوٹے

تو زوجہ اول کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے عم محترم کی دوسری صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا اور یہیں سے آپ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ جو آپ کے تمام کارناموں میں اولیت کا مقام رکھتا ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے اولین نقوش کی ابتداء ہوتی ہے کہ جس کے لیے قدرت نے آپ کو منتخب کیا تھا۔ مشاہد فطرت کے جمال جہاں آرا کا نقش دل پر پوری طرح قائم ہو چکا تھا اب اس کی مشاطگی کا فریضہ پورا کرنا آپ کے ذمے تھا۔ چنانچہ قلب صافی کی رہنمائی اور مرشد والا تبار کی ہدایت کے مطابق آپ نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اور ہجرت کی وہ سنت پوری کی جو ابتداء ہی سے عباد اللہ کا مقدر رہو چکی ہے۔

ورود ہند

چنانچہ آپ مع اہل و عیال دسویں صدی ہجری کے وسط میں وارد ہند ہوئے۔ یہ غالباً ۹۲۸ھ کا وقت تھا۔ بلند روحانیت، علوم دین کے حصول، ترک دنیا، پیہم ریاضت اور فراست دینی کے ذریعہ آپ نے شیوخ وقت بالخصوص بزرگان قادریہ میں جو مقام حاصل کیا تھا۔ اس کے متعلق حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے مبداء و معاد میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ قابل غور ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ کمال قادری کس پایہ کے بزرگ تھے۔

+ امام ربانی کی شہادت +

وہ فرماتے ہیں۔ "جب ہم کو خاندان قادریہ کے مشائخ کا کشف ہوتا ہے تو حضرت غوث الثقلین سیدنا عبد القادر جیلانی کے بعد حضرت شاہ کمال قادری جیسا کوئی بزرگ نظر نہیں آتا"۔

+ علمیت +

نیز آپ کی علمی فضیلت اور اسرار طریقت میں دستگاہ کا احوال اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے جسے شیخ عبد الاحد (پدر بزرگوار امام ربانی مجدد الف ثانی) مجلس احباب میں اکثر دہرایا کرتے تھے۔

زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ شیخ عبد الاحد سے نقل ہے کہ " جب اعلحضرت علمی اسرار و معارف بیان کرنے پر آتے تو بعض اوقات وہ دقائق و اسرار بیان کرتے کہ سامعین مہارت علمی رکھنے کے باوجود تامل و تفکر بسیار کے بعد حل کر سکتے اور سمجھ سکتے تھے " اس بیان کے ساتھ ہی یہ رباعی بھی درج ہے۔

ارباب بقا زندہ بجان دگراند
بیروں ز دو کون و درجہاں درگراند

کس پے بزباں حال ایشاں نبرد
ایں طائفہ گویا بزبان دگر اند

ہندوستان میں آپ کے ورود کی کوئی قطعی تاریخ تو متعین نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ قطعی طے شدہ ہے کہ آپ جب پہلے پہل وارد ہندوستان ہوئے اس وقت ابراہیم لودھی سریر آئے سلطنت تھا۔ سندھ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد آپ نے سب سے اول بلدہ ملتان میں قیام کیا۔ وہی ملتان جس کے بارہ میں طوطی گلزار ہند حضرت امیر خسرو نے کہا ہے۔

ملتان ما بجنت اعلٰے برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کند

گویا آپ کا ورود ملتان ۹۲۰ھ میں ہوا۔ تذکرہ حدیقتہ الخوارق سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان میں چند روزہ قیام کے بعد آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ بے ریا زہد، خلوص سے آراستہ عمل اور حقائق آشنا علم کے موتیوں سے جس کا دامنِ حیات آراستہ ہو وہ افق عالم پر بدر کامل بن کر کیسے نہ چمکتا۔

چنانچہ آپ کے آستانہ پر خواص و عام، درویش و غنی ہر نوع کے آدمیوں کا جمگھٹ رہنے لگا۔

شیر شاہ سوری کا ہدیہ:۔ اسی اثنا میں آپ کے کمالات پر شیر شاہ سوری کو اطلاع ہوئی۔ تو

اس نے ایک ہزار اشرفیاں خدمتِ اقدس میں روانہ کیں۔ بادشاہ کا فرستادہ جب یہ رقم خطیر لے کر حاضر خدمت ہوا۔ تو آپ نے یہ کہہ کر اس نذرانہ کو واپس کر دیا۔ " دولت دنیا سے درویشوں کو کیا واسطہ اور فرمایا کہ بادشاہ سے کہہ دیجیے۔ کہ ہم اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھے بادشاہ کے لیے اور کافہ اہلِ اسلام کے لیے مصروف دعا ہیں۔ اور اس کے لیے کسی رقم کی حاجت نہیں "

دنیاداروں کے پاس ان فرمانروایان اقلیم قناعت کے پھانسنے کے لئے سب سے بڑا حربہ سکوں کی جھنکار ہے۔ لیکن جب عملاً یہاں سے یہ جواب ملتا ہے۔

برو این دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

تو ان لوگوں کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ان بادشاہوں کو جو عالم گھیرے رہتے ہیں۔ اور جن درویشوں کی شکم پری ان کے دستر خواں کی ریزہ چینی سے ہوتی ہے۔ یہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ یہ دونوں گروہ ایک ادنے سے سکہ کے لئے مرمٹنے والے اک اک لقمہ کے لئے جان دینے والے ہیں۔ لیکن جب کسی ایسے شہباز فضائے قناعت اور ہمائے اوج ولایت سے واسطہ پڑتا ہے۔ تو عالم ہی کچھ اور نظر آتا ہے۔ کہ بہت سے وہ لوگ کہ جن کا ظاہر بڑا ہی آراستہ ہے۔ اور ان کا ہر قدم جو اٹھتا ہے۔ وہ شریعت کے راستہ پر ناپ تول کر اٹھتا ہے۔ لیکن جب کبھی اس راہ پر چلنا پڑتا ہے کہ جہاں چند قدم آزمائش میں ڈالنے والے بھی ہوں۔ تو یہ اول قدم ہی پر پھسل جاتے ہیں۔ اور ایک یہ گروہ ہے کہ کسی قسم کی تحریص اور کوئی ترغیب انہیں اپنے راہ سے نہیں ہٹا سکتی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ تقدس فروشی کی دوکانیں بہت ہیں۔ خالص حال تو حال خال ہی کسی جگہ دستیاب ہو سکتا ہے۔

یہ سطور محض ضمناً لکھی گئی ہیں کہ

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

ابتدا ہی سے دجل و فریب کی دکانیں آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہیں۔ اور نادان گاہکوں کے ایمان کی جیبیں کاٹی جاتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا سوداگر آ نکلتا ہے جو سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنی دوکان لگاتا ہے۔ تو ان تقدس فروش حلقوں میں تہلکہ برپا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایک جان ہو کر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس اللہ کے بندے کو میدان سے ہٹانے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کرتے ہیں جو شاید ادنے سے ادنے دنیادار بھی استعمال نہ کر سکے۔

بہر حال حضرت شاہ کمالؒ نے بلدہ ملتان کو اپنا مستقر قرار دیا۔ اور اقطاع ہند کی سیر کو چل نکلے۔ لاہور۔ دلی۔ آگرہ اجمیر شریف۔ احمد آباد وغیرہ مشہور شہروں کی سیر و قیام کے دوران آپؒ نے اہل اسلام کی حالت کو بچشم خود ملاحظہ فرمایا۔

ہندوستان کی سیاسی حالت

اور دیکھا کہ علماء کی جاہ طلبی۔ درویشوں کی دنیا پرستی اور امراء کی غفلت کوشی سے اہل اسلام کس زبوں حالت میں گرفتار ہیں۔ حکومت کے عدم استحکام کو بھی ان حالات میں بڑا دخل تھا۔ بابر کی یلغار نے بلاشبہ رانا سانگا اور میدنی رائے جیسے کفر و شرک کے ستونوں کو زمیں بوس کر دیا تھا۔ لیکن وہ بہت جلد اپنی فتوحات کا ثمر اپنے بیٹے ہمایوں کے سپرد کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ہمایوں طبعاً نرم دل اور مروت کیش انسان تھا۔ جس کے نتیجہ میں اسے اپنوں اور بیگانوں دونوں کے ہاتھوں چشم زخم پہنچا۔ برادران نامہربان کے لگائے ہوئے زخم نہ بھرے تھے کہ مشرق سے ایک طوفان اٹھا۔ جو ابتداء میں معمولی ہوا کے جھونکوں سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن ادنے سی مدت میں اس نے مغل حکومت کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ یہ شیر شاہ سوری تھا۔ کہ جس کی ترک تازیوں نے ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور پندرہ سال تک وہ جلا وطنی کی سی کیفیت میں زندگی بسر کرتا رہا۔ شیر شاہ بلاشبہ قابل ترین حکمران تھا۔ لیکن اس کے افقِ حیات پر ہلالِ عید نے شام کے وقت طلوع کیا تھا۔ پانچ سال کے بعد اسے بھی دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کے جانشینوں میں حکومت

کی قابلیت اور دینی حمیت کی کمی نہ تھی۔ لیکن وہ شیر شاہ نہ تھے۔ لہذا حکومت کے عدم استحکام کی وہ کیفیت جو ایک ڈیڑھ صدی سے قائم تھی۔ اس سرزمین کے لیے کچھ ایسی خوشگوار نہ تھی۔ ان حالات میں موقع شناس جاہ پرستوں کی بن آتی ہے۔ اور انہیں اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے ایک وسیع میدان مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس دور کے علماء اور مشائخ کی جو کیفیت تاریخوں میں مرقوم ہے۔ اُس سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ گروہ خود کتنی خرابیوں میں مبتلا تھا۔ اور دنیا طلبی کی راہ میں کس شدت سے گامزن تھا۔ عوام کی اصلاح کا فریضہ، اور احکام شریعت کے اجراء کے لیے یہ کہاں سے وقت نکال سکتے تھے۔ یہ تو اپنے اقتدار کے قصر و گنبد ہی کی تعمیر سے فارغ نہ تھے۔

حکومت کا عدم استحکام اور ملکی حالات کا تنزل ہمایوں کے نامور فرزند اکبر نے تخت نشین ہوتے ہی ختم کر دیا۔ اور ایک ایسی مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی۔ جسے دو سو (۲۰۰) سال تک حوادث روزگار کی کوئی جنبش اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی۔ لیکن اکبر کے مسند آرائے حکومت ہونے سے قبل اور اس کی عنان حکومت سنبھالنے کے بعد دیر تک علماء و مشائخ کی جو کیفیت رہی۔ اس کا ردعمل دین الٰہی اکبر شاہی کی صورت میں نکلا۔ اور اس گروہ کے آپس کے مناقشات کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ فیضی اور ابوالفضل اور ان کے ذہین باپ شیخ مبارک کی علمی فسوں سازیوں نے بادشاہ کو مجتہد وقت کا درجہ دے دیا۔ ایک علم سے بے بہرہ اور خود سر مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں ایسی طاقت کا مجتمع ہونا جو خطرناک نتائج پیدا کر سکتا تھا وہی نتائج اس نے پیدا کیے۔

اعلیحضرت نے ہندوستان کے جو موجودہ حالات تھے ان کا مشاہدہ بچشم خود کیا۔ اور نگاہ دور بین سے ان واقعات کو بھی بھانپ لیا۔ جو اسلامی حلقوں کو پیش آنے والے تھے۔ چنانچہ یہیں سے اُس کار عظیم کی بنیاد یہاں رکھی گئی۔ کہ جس کی خاطر آپ ترک وطن کر کے ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ یعنی ایسے طریق تصوف کا اجراء۔ جو محافظ شریعت ہو۔ اور ایسے افراد کی تربیت جو اپنے موقف کو صحیح طور سے سمجھنے کے علاوہ اس کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کی مکمل استعداد رکھتے ہوں۔ چنانچہ تین چار سال تک متواتر سیاحت کے بعد آپ نے کیتھل شہر میں مستقل قیام فرمانے

کا ارادہ کر لیا۔ اور ملتان سے معہ اہل و عیال۔ یہاں تشریف لے آئے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کیتھل کے متعلق کچھ تاریخی و تمدنی حالات بیان کر دوں۔

کیتھل:۔ کیونکہ یہ شہر میرا اور میرے بزرگوں کا وطن ہونے کے سبب ایک خاص دلکشی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور سب سے بڑا اعزاز جو اس شہر کو حاصل ہے وہ یہ کہ اس کی خاک میں جہاں اور بے شمار صاحب کمال ہستیاں آسودہ خواب ہیں۔ وہاں اعلٰحضرت شاہ کمال ؒ اور حضرت شاہ سکندر محبوب الہیؒ جیسے فخر روزگار اور تاریخ ساز بزرگ بھی دفن ہیں۔

آں خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

یہ شہر اس سرزمین میں واقع ہے جہاں مہابھارت کی مشہور و معروف جنگ لڑی گئی تھی۔ ہندوؤں کے مذہبی معتقدات کے لحاظ سے یہ سرزمین ایک خاص تقدس کی حامل ہے۔ یقینی طور سے تو کچھ بھی کہا نہیں جاسکتا۔ کہ یہ شہر کب آباد ہوا تھا۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ یہ آبادی قدیم ہندو عہد کی یادگار ہے۔ کیونکہ اس کے چاروں طرف ہندوؤں کے قدیم طرز کے مندر۔ تالاب اور دیگر نشانات پھیلے ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک کیتھل شہر ضلع کرنال مشرقی پنجاب کی ایک تحصیل تھی۔ ہندوؤں کے مشہور تیرتھ کوروکشیترا۔ پھلگو۔ پہوہ وغیرہ اس کے نزدیک ہی تھے۔ اس شہر کے جنوب میں سوا سو میل پر دلی تھی۔ اور شمال میں اتنے ہی فاصلہ پر شملہ سپاٹو وغیرہ کی پہاڑیاں تھیں۔ جانب مشرق پانی پت اور ترائن (تراوڑی) کے وہ مقامات تھے۔ جہاں بارہا ہندوستان کی تقدیر کے فیصلے تلوار کی نوک سے لکھے گئے۔

یہ تمام علاقہ نہایت زرخیز اور اس کی آب و ہوا معتدل و دل آویز ہے۔ زمین کے وسیع قطعات جنگلات سے گھرے ہوئے ہیں۔ جہاں ہر قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ برسات کے موسم میں اس سرزمین کا حسن اور بھی نکھر آتا تھا۔ جنگلی پھل پھول اپنی بہار دکھاتے اور ناظرین کا دل لبھاتے تھے۔ ہر قسم کے چرند پرند کللیں کرتے اور صانع حقیقی کے کمال تخلیق کا نقش دلوں پر

بہاتے تھے۔ شمال مغرب میں دو ندیاں گھاگرا اور سرسوتی بہتی تھیں۔ جو اس علاقہ کی سرسبزی میں اضافہ کرنے کے علاوہ اس کی قدرتی سرحد بھی بناتی تھیں۔ یوں تو ہر طرف بڑے بڑے تالاب پانی سے لبریز نظر آتے تھے۔ لیکن خاص نواح کیتھل میں تو ان کی بڑی بہتات تھی۔ برسات کے زمانہ میں ان پر بہار کا عالم ہوتا تھا۔ صاف ستھرے پانی میں آسمان کا عکس پڑتا تھا۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ سمندر اپنی وسعتوں کو سمیٹ کر یہاں آن بیٹھا ہے۔ سطح آب پر کنول کے پھول جھومتے تھے۔ تو ایک چکا چوند کا عالم پیدا ہو جاتا تھا۔ ہر تالاب کے کنارے پر مندر ہوتا تھا۔ جہاں سے ساز کا آہنگ اور موسیقی کی تانیں بلند ہو کر ستاروں تک کو گوش بر آواز کیا کرتی تھیں۔ خدا جانے یہ سرزمین کب سے امن و سکون کے گہوارہ میں خواب راحت کے لطف اٹھا رہی تھی۔ کہ چھٹی صدی ہجری کی ابتداء میں سلاطین اسلام کی یلغاروں نے اس سرزمین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جو حملہ آور شمال مغربی۔ پہاڑیوں کو عبور کر کے ہندوستان میں قدم رکھتے تھے۔ ان کی منزل مقصود دلی ہوتی تھی۔ اور دلی کی طرف یلغار کرنے والوں کی راہ میں لازماً یہ خطہ بھی آتا تھا۔ یہاں وہ قوم آباد تھی۔ صدیوں کے امن و سکون اور عیش و عشرت نے جس کے قوائے عمل کو بیکار کر دیا تھا۔ طاؤس و رباب ہی جس کی زندگی کا منتہائے مقصود تھا۔ ایک ایسی قوم کے سامنے کہ جس کی رگوں میں جوش عمل کا خون موجزن تھا۔ ان لوگوں نے کیا ٹھہرنا تھا۔ کہ جن کی آنکھوں پر عشرت کی آسودگی نے غفلت کے پردے ڈال رکھے تھے۔ چنانچہ عساکر اسلام کو یہاں بھی بارہا مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر سیل تندرو کہیں ریت کے بند باندھنے سے رکا کرتے ہیں۔ غازیان اسلام کے مدنظر ہمیشہ شہادت کی تمنا رہی ہے۔ جنہیں موت زندگی سے زیادہ عزیز ہو۔ ان کا راستہ کون روک سکتا ہے۔ چنانچہ مانند ابر بہار کاروان اسلام اس سرزمین کو بھی اپنے خون سے سیراب کر گیا۔ اندرون شہر اور بیرون شہر بہت سے مزارات ان شہیدوں کے ہیں۔ جنہوں نے شمع ناموس مصطفویؐ پر پروانہ وار اپنی جانیں قربان کیں۔ جب بھی مسلمان فاتحین نے کسی سرزمین کا رخ کیا تو ان کے ساتھ وہ قدسی صفات بزرگ بھی آتے۔ جن کی زندگی کا منتہائے مقصود ہمیشہ تبلیغ اسلام رہا

ہے۔ اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے بے شمار مزارات شہر اور دیار و امصار میں اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ کہ نخل اسلام کی آبیاری کے لیے جس طرح غازیان اسلام نے اپنا خون بہایا۔ اسی طرح ان حضرات نے زندگی کی ہر راحت شجر اسلام کی آبرومندی کے لیے وقف کر دی۔ میرے بزرگوں کے ملفوظات میں جن اولیائے کرام کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے چند ایک کے حالات کا یہاں بیان کرنا خالی از لطف نہ ہو گا۔

شاہ ولایت حضرت خواجہ عبدالرشیدؒ

یہ بزرگ کیتھل میں آنے والے بزرگوں میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں آپ کا عالیشان مزار اور مزار کے ساتھ ملحقہ مسجد و دیگر عمارات عین شہر کے وسط میں واقع ہیں۔ مسجد آپ کے مزار سے پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ اس مسجد کے درمیانی دروازہ کی پیشانی پر ایک کتبہ آویزاں تھا۔ کتبہ کی عبارت نہایت ادق اور گنجلک تھی۔ تمام کتبہ پڑھا نہیں جاتا تھا۔ صرف علاء الدین غوری کا نام پڑھا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی علاء الدین غوری ہو۔ جس نے اپنے بھائی کے قتل کے انتقام میں غزنی کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ اور اسی حرکت کے سبب اس کا نام علاء الدین جہاں سوز مشہور ہوا۔ یہ مسجد اسی نے بنوائی ہو یا اس کے عہد امارت میں تعمیر ہوئی ہو۔ چونکہ بہرام شاہ غزنوی کے زمانہ بادشاہت میں کیتھل بھی ولایت پنجاب میں شامل تھا۔ غوری امرا غزنویوں کی سلطنت کے ارکین تھے۔ ممکن ہے کہ علاء الدین غوری ولایت پنجاب کی امارت پر فائز رہا ہو۔ اور اس نے کیتھل میں یہ مسجد بنوائی ہو۔ اگر یہ قیاس درست تسلیم کر لیا جائے۔ تو مسجد کی تعمیر ۵۵۶ھ سے قبل ہوئی۔ علاء الدین جہاں سوز کا سن وفات یہی ہے۔ حضرت شاہ ولایت نے اسی مسجد کے نزدیک قیام کیا۔ تمام زندگی تجرد میں گذاری۔ نذر و نیاز از قسم سیم و زر کسی سے قبول نہ کرتے تھے۔ ایک مرید نے مصلے کے نیچے ایک اشرفی رکھ دی۔ آپ کا ہاتھ اس اشرفی پر لگ گیا۔ آپ کو شدت سے گھن آئی۔ اور اس انگلی کو اینٹ پر رگڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ انگلی پر زخم ہو گیا۔ وہ زخم بگڑ گیا۔ یہاں

تک کہ وہ آپ کی موت کا سبب بن گیا۔ مسجد کے ساتھ ہی آپ کا مزار تعمیر ہوا۔ ان تمام عمارات سے نہایت رعب و جلال ٹپکتا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی انسان کا دل متاثر ہوتا۔ اور عبد اور معبود دونوں کی عظمت کا نقش روح پر آراستہ ہو جاتا تھا۔ آپ نے سلطان التمش کے زمانہ میں ۶۳۳ ھ میں وفات پائی۔

حضرت سید کمال ترمذیؒ

آپ سادات بنی فاطمہؓ میں سے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب پندرہ واسطوں سے امیر المومنین حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے شجرہ نسب یوں ہے۔ ۱) سید کمال۔ ۲) سید عثمان۔ ۳) سید عبد اللہ۔ ۴) سید ابو طاہر۔ ۵) سید طاہر۔ ۶) سید عبد الرشید۔ ۷) سید علی۔ ۸) سید حسین۔ ۹) سید احمد۔ ۱۰) سید عمر۔ ۱۱) سید یحییٰ ۱۲) سید حسین اصغر۔ ۱۳) امام زین العابدین۔ ۱۴) امام حسین۔ ۱۵) حضرت علیؓ۔

ایک قلمی تذکرہ میں آپ کے ورود ہند کا زمانہ ۵۷۸ ھ بیان کیا گیا ہے۔ اور آپ کی وفات ۶۰۰ ھ میں ہوئی۔ وطن مالوف ترمذ تھا۔ جو صوبہ ازبکستان میں دریائے آموں کے کنارے آباد ہے۔ آپ سلطان غوری کے ساتھ بہ نیت جہاد وارد ہند ہوئے۔ فتح ہند کے بعد آپ کو کیتھل کی فضا ایسی پسند آئی کہ یہیں قیام کا مستقل ارادہ کر لیا۔

کیتھل کے جانب مغرب ایک پر فضا مقام پر آپ کا مزار مرجع خلائق تھا۔ بہت سی کرامات آپ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ کے صاحبزادگان کی تعداد گیارہ تھی جن میں سے تین صاحبزادے کیتھل میں رہے اور بقیہ اطراف و اکناف ہند میں پھیل گئے۔ کیتھل میں اس خاندان نے علمی اور دنیوی لحاظ سے بڑا عروج حاصل کیا۔ چنانچہ سلطان محمود تغلق نے اس خاندان کے ایک فرد سید حسن نامی کو ساحل کارومنڈل پر علاقہ معبر کا حاکم مقرر کیا۔

سید حسن کیتھلی حاکم معبر۔ سید حسن کیتھلی نے سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد

لوائے آزادی بلند کیا۔ اور اپنی آزادانہ حکومت قائم کر کے جلال الدین احسن شاہ کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ جب اس علاقہ میں پہنچا۔ تو آپ نے اس کی بڑی مدارات کی۔ یہاں تک کہ اپنی صاحبزادی حور جمال بھی اس کے عقد میں دے دی۔ سید حسن جلال الدین حضرت سید کمال ترمذی کے آٹھویں فرزند تھے۔

ضیاء الدین برنی کی ننھیال

مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کی ننھیال بھی کیتھل کے اسی خاندان میں تھی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ " کیتھل کے سادات کی بزرگی اور ان کے نسب کی صحت مشہور و معروف ہے۔ اور مولف کی والدہ ماجدہ سید جلال الدین کیتھلی کی دخترِ نیک اختر ہیں اور سید جلال الدین کیتھل کے صاحب عظمت و عزت بزرگوں میں سے ہیں۔ اور میری والدہ ماجدہ صاحب کشف و کرامت ہیں۔ جن کی بہت سی کرامات مشاہدہ میں آئی ہیں" ۔

عہد خلجی میں اس خاندان کے دو بزرگوں نے بڑی شہرت پائی۔ سید مغیث الدین اور سید مجیب الدین دونوں حقیقی بھائی تھے۔ اور علم و فضل اور زہد و اتقا کی بناء پر مشہورِ عالم تھے علاء الدین خلجی کے ہمعصر تھے۔

یہ تو تھا بزرگان دین کا احوال کہ جن کے نفوس قدسی کی برکت سے اس نواح میں اسلام کا نور پھیلا شاہی عمارات میں مسجد جامع خلجی عہد کی یادگار تھی۔ کہ جس کی عظمت و رفعت ہر کس و ناکس سے خراج تحسین حاصل کرتی تھی۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وسیع و عریض صحن آتا تھا۔ مسجد کی عمارت دس گنبدوں سے مزین تھی۔ کہ جن کی عظمت کے سامنے گنبد فلک بھی سرنگوں نظر آتا تھا۔ شہر سے جانب غرب دو تین میل کے فاصلہ پر ایک شکستہ و خستہ مقبرہ تھا۔ مقبرہ کے او نشانات تو دست برد زمانہ کی نذر ہو چکے تھے۔ ایک چبوترہ باقی تھا۔ کہ جس پر دو قبریں تھیں۔ چبوترہ کا بغور معائنہ کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف مینار بھی تھے۔ کہ جن کے ٹکڑے مر

طرف بکھرے پڑے تھے۔ چبوترہ کے نیچے ایک بلند دروازہ کی محراب نظر آتی تھی۔ جس کے اندر جانے کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ نزدیک ہی تین گنبدوں پر مشتمل ایک مسجد تھی۔ جو جابجا سے گر رہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی نشان باقی نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ یہ مقبرہ رضیہ سلطانہ (دختر سلطان شمس الدین التمش) کا تھا۔ اللہ اللہ ! یہ اس سلطانہ ہند کی آخری آرام گاہ ہے کہ جس کے نام سے کبھی ہندوستان کے در و دیوار لرزتے تھے۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ جب حاکم بھٹنڈا کی ہمراہی میں رضیہ سلطانہ نے شکست کھائی تو کیتھل کے نواح میں پناہ لی۔ لیکن ستارہ اقبال غروب ہو چکا تھا! کسی گنوار نے ملبوسات اور زیورات کے لالچ میں شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر قتل کر ڈالا۔ اور یہی جگہ اس عظیم المرتبت سلطانہ کی آخری آرامگاہ قرار پائی۔ عبرت کی آنکھیں یہ نظارہ دیکھ کر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ کہ عیش و عشرت کی آغوش میں آنکھ کھولنے والی اور جاہ و جلال کے سایہ میں پرورش پانے والی شہزادی کس ویرانہ میں محو خواب ہے۔ اس مزار کی ویرانی دیکھ کر بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

بر مزارے ما غریباں نے چراغے نے گلے

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ شہر قلیل عرصہ میں علمی۔ تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے ترقی کر گیا۔ وہ بزرگ جنہوں نے ایران و خراسان۔ ہرات و بدخشان کی گل بدامن سرزمین سے ہجرت کر کے اس خرابہ کو آباد کیا تھا۔ انہوں نے یہاں علم و فضل اور زہد و اتقا کی وہ شمعیں روشن کیں۔ کہ ان کی روشنی صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اہل نظر کی آنکھوں کو روشن کرتی ہے۔ امن و سکون نے پورے دو سو سال اس سرزمین کو آسمان کا ہمسر بنا گئے۔ تا آنکہ فرغانہ کی وادیوں میں سے وہ طوفان اٹھا کہ جس نے ہندوستان کے درو دیوار ہلا کر رکھ دئیے۔ ۸۰۰ ھ کا زمانہ اس ملک کے لیے بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ خاندان تغلق کے بادشاہوں کا آخری دور تھا۔ دلی کی مرکزی حکومت اپنا اثر و رسوخ و نفوذ کھو چکی تھی۔ کہ سیلاب بلا کی مانند امیر تیمور اس سرزمیں پر نازل ہوا۔ دلی کی طرف یلغار کرتے ہوئے۔ اس کے دست

تقاول کی غارتگری سے یہ شہر بھی محفوظ نہ رہا۔ اور ایک بار وہ شمعیں بجھ گئیں کہ جن کے روشن کرنے میں اہل فضل و ہنر نے اپنی تمام دانش و حکمت صرف کی تھی۔ لیکن امیر تیمور کی آمد ایک ہولناک طوفان سے زیادہ نہ تھی۔ کہ آیا اور گذر گیا۔

اور یہاں بدستور وہی بساط دانش اور بزم علم برپا ہو گئی۔ جو چند لموں کے لیے لپیٹ کر رکھ دی گئی تھی۔ یہ تھے کیتھل کے مختصر تاریخی واقعات۔ کہ جسے حضرت شاہ کمال قادری نے اپنے قیام کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ حضرت شاہ کمال نے شہر سے ایک میل دور جانب مشرق ایک خاموش اور پرفضا مقام کو اپنی رہائش کے لیے منتخب فرمایا۔ اور ایک قدیم وسیع تالاب بدھ کدار کے کنارے ٹیلہ پر اپنا مسکن بنایا۔ یہیں سے آپ کی اس دعوت کا آغاز ہوا۔ آگے چل کر جس کے نتائج نہایت شاندار نکلے۔

کرامات:۔ ہندوستان میں اشاعت اسلام کا بنیادی سبب بلاشبہ بزرگان دین اور اولیاء اللہ کا بلند کردار، اعلیٰ تعلیمات اور بے ریا عمل تھا۔ لیکن چونکہ مشرق بالخصوص ہندوستان کا مزاج ایک مخصوص نوعیت کا حامل تھا۔ یہاں کسی بھی مبلغ اسلام کو اس وقت تک کامیابی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اور نہ وہ شہرت کے بلند بام حد تک رسائی پا سکتا تھا۔ جب تک اس سے کرامات کا ظہور نہ ہوتا۔ چنانچہ جتنے بھی بلند پایہ بزرگ اور ولی اللہ یہاں گذرے ہیں۔ ان کی زندگی میں دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے کرامات کا وجود ضرور ملے گا۔ اس کے بغیر شاید اپنے مشن میں کامیاب ہی نہ ہو سکتے تھے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان حضرات کے حالات پر مشتمل جو قدیم تذکرے ملتے ہیں۔ ان میں سوائے ان کی کرامات کے اور کوئی ذکر مشکل ہی سے ملے گا۔ چنانچہ ان بزرگوں کی سوانح حیات ان تذکروں سے مرتب کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا سنگلاخ چٹانوں میں سے جوئے شیر کا لانا۔ یہ ذکر ضمناً آگیا۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ جب حضرت شاہ کمال صاحب کیتھل میں مستقل طور سے قیام پذیر ہوئے۔ تو آپ سے متواتر چند ایک ایسی کرامات سرزد ہوئیں۔ کہ ہر کس و ناکس آپ کی طرف

متوجہ ہو گیا اور وہ مقام جہاں آپ کی رہائش گاہ تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک ویرانہ تھا رونق میں شہروں سے بھی آگے نکل گیا۔

روایت ہے کہ کیتھل میں آپ کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ کہ اہل شہر میں سے ایک صاحب نام نمود کا انتقال ہو گیا۔ اخوت اسلامی کے جذبہ کے تحت آپ بھی اس کے جنازہ پر پہنچے۔ لوگوں کو یہ

میت کی بیعت + تو معلوم ہو ہی چکا تھا۔ کہ ... آپ سلسلہ قادریہ کے بزرگ ہیں اور دودمان غوثیہ کے روشن چراغ اور وارث ہیں۔ لہذا آپ کے آتے ہی میت کے ورثا نے جزع و فزع کے ساتھ کہا۔ کہ صد حیف۔ مرحوم کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی جو اسے زندگی میں شدت سے بے چین رکھتی تھی کہ وہ خاندان قادریہ کے کسی کامل بزرگ کے ہاتھ پر بیعت اختیار کرے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا ! " یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اگر اس کی خواہش ہو تو اب بھی اسے سلسلہ قادریہ میں بیعت کیا جاسکتا ہے " لوگ حیران تھے کہ آخر ایک مردہ کس طرح اپنی خواہش کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ حیرانی اس وقت ہزار گنا بڑھ گئی۔ جب کفن میں سے آواز آئی " ہاں حضور ! مجھے سلسلہ قادریہ میں بیعت فرمالیں " ۔ چنانچہ آپ نے اس رہگذرے عالم بالا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور بیعت سے مشرف فرمایا۔ یہ واقعہ ایسا تھا۔ کہ اس کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دور و نزدیک پھیل گئی۔ اور خلق خدا گروہ در گروہ آپ کے پاس آنے لگی۔

مفتیان کیتھل + لیکن کچھ ازلی بدبخت ایسے بھی ہوتے ہیں۔ کہ جنہیں دنیا میں سوائے نکتہ چینی اور بدنیتی کے شغل کے اور کسی شغل سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ جب آپ کی شہرت زیادہ ہوئی

اور مخلوق نے ادھر رجوع کیا۔ تو کیتھل کے ایک قدیم خاندان کے نمودار لوگوں کو آپ سے حسد لاحق ہوا۔ یہ مفتیوں کا خاندان کہلاتا تھا۔ اور قدیم سے علوم عقلی و نقلی کے سرمایہ کا خزینہ تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان وارثان مسند علم کو ہمیشہ بوریہ نشین درویشوں کی ہمہ گیری اور

دلعزیزی کھٹکتی آئی ہے۔ چنانچہ ان حضرات نے آپ کے حق میں زبان طعن دراز کرنی شروع کر دی۔ آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے تو قسم قسم کے سوال کرتے جیسا کہ عمل سے بے بہرہ اہل علم کا قاعدہ ہے۔ کہ زبان سے جہاد کا موقعہ آتے تو صف اول میں ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں عمل کی کٹھن وادی میں قدم رکھنے کی نوبت آئی تو گوشۂ عافیت میں جا چھپتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ نئی سے نئی حجت نکالتے۔ آپ کے اعمال و اشغال میں حارج ہوتے۔ کلمہ گویوں کی تکفیر کا ہتھیار تو ایک چلتا ہوا جادو ہے۔ جو ہر وقت ان کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ فروعی مسائل میں اختلاف پر بھی بے تکلف یہ تکفیر کا تیر چلا دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی۔ اعلحضرت کے مدِ نظر جو مقصد حیات تھا۔ یہ حضرات اس سے قطعی خالی الذہن اپنی روش پر گامزن رہے۔ آپ کبھی تو ان کی حرکات مذبوحی کو نظرانداز کرنے ہی پر اکتفا کرتے۔ کبھی گفتار و کردار سے ان کی تسلی کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن؎ دل کبھی سیدھے ہوتے ہیں۔ کجروی جن کا قبلہ مقصود ہو۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ ان مفتیان کرام نے آپ کا اور آپ کے خادم کا باہر نکلنا دشوار کر دیا۔ اس وقت ترکش قضا سے ایک تیر نکلا۔ اور مفتیوں کے لیے پیغام اجل ثابت ہوا۔ یعنی جب مفتیوں کی زیادتیاں اور گستاخیاں حد سے سوا ہو گئیں۔ تو آپ کی زبان سے بددعا نکلی۔ اس کے بعد ان لوگوں کو مختلف آفات سماوی و ارضی نے یوں گھیرا۔ کہ ان کی تباہی دوسروں کے لیے سامان عبرت بن گئی۔

حضرت شیخ جلال الدین تھانیسریؒ سے ملاقات + کیتھل میں مستقل قیام کے بعد بھی آپ کے ذوق سیاحت میں کچھ کمی نہ آئی تھی ایک دفعہ آپ عازم تھانیسر ہوتے۔ یہ قصبہ ان دنوں شیخ جلال الدین تھانیسری کے جاہ و جلال روحانی کا مرکز تھا۔ آپ درویشوں اور صوفیوں کے علی الرغم سپاہیانہ لباس میں حضرت شیخ کی مجلس میں پہنچے۔ زبدۃ المقامات میں منقول ہے "کہ حضرت شاہ کمالؒ کو سپاہیانہ لباس میں ملبوس دیکھ کر حضرت شیخ نے سمجھا کہ یہ کوئی سپاہی ہے۔

چنانچہ وہ ان سے بادشاہ کے متعلق استفسار کرنے لگے۔ حضرت شاہ کمالؒ اس سوال سے سخت برآفروختہ اور آشفتہ خاطر ہوئے۔ اور گویا ہوئے "کہ اے شیخ! اگر کوئی مسکین مساکین اس راہ سے انوار الہیہ اقتباس کرنے کی غرض سے آئے تو آپ کو زیبا نہیں کہ اس سے شاہ و سپاہ کی خبریں پوچھنے لگیں۔ آپ اگر اس قسم کی خبریں پوچھنا چاہتے ہیں۔ تو بر سر راہ نشست رکھیں۔ اور راستے سے گذرنے والوں سے یہ خبریں پوچھتے رہیں۔ شیخ جلال الدین نہایت حلم و بردباری سے معذرت کرنے لگے" اس مجلس میں شیخ عبد الاحد فاروقی سرہندی بھی موجود تھے۔ انہوں نے جو حضرت شاہ کمال کی یہ بے تعلقی اور اس جذبہ کو دیکھا تو ارادہ کرلیا کہ جب یہ مجلس سے نکلیں گے تو ان سے ملاقات کروں گا۔ ا/

شیخ عبد الاحد سے مراسم + پتہ ونشان دریافت کروں گا۔ چنانچہ جب یہ مجلس سے باہر نکلے۔ تو شیخ عبد الاحد فاروقی بھی ساتھ ہی باہر آ گئے۔ اعلحضرت سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔ نام و نشان دریافت کیا۔ اور یہیں سے دونوں کے درمیان محبت و الفت کا رابطہ قائم ہوا" یہ سلسلہ محبت و مودت اس حد تک بڑھا کہ اعلحضرت معہ اہل و عیال سرہند تشریف لے جاتے اور وہاں کئی کئی دن قیام فرماتے۔ زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ" شیخ عبد الاحد نے حضرت کی خدمت میں رہ کر بے شمار فوائد حاصل کیے۔ اور اثنائے مجالست و مصاحبت میں انہوں نے بہت سے غرائب معاملات اور خوارق عادات آپ سے معائنہ کیے"۔ اور جب یہ انس و محبت اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ تو آپ نے اعلحضرت سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی۔ اور وہ مقام حاصل کیا جس کا ذکر مبدء و معاد کی ابتداء میں حضرت امام ربانی نے کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

آپ کا مقام فردیت + " ایں درویش را مایہ نسبت فردیت از پدر بزرگوار خود حاصل شدہ بود۔ و پدر بزرگوار اورا از عزیزے کہ جذبہ قوی داشتند۔ و بخوارق مشہور بودند بدست آمدہ بود۔"

ترجمہ:- اس درویش کو مایہ فردیت کی نسبت اپنے والد محترم سے حاصل ہوئی تھی۔ اور انہوں نے یہ ایک بزرگ سے حاصل کی تھی۔ جنہیں جذبہ قوی حاصل تھا۔ اور وہ خوارق عادات میں معروف تھے۔

زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ اس عبارت میں "عزیز قوی الجذبہ" سے مراد حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی رحمۃ ہیں۔

اعلحضرت کے دست حق پرست پر بیعت کر کے داخل سلسلہ ہو جانے کے بعد ان دونوں بزرگوں میں ربط و ضبط اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اور شیخ عبدالاحد کو وہ دولت میسر آئی۔ کہ جسے تصوف کی اصطلاح میں مایہ فردیت کہا جاتا ہے۔ اعلحضرت کے خوارق عادات اور اظہار کرامات کا تذکرہ شیخ عبدالاحد نے متعدد جگہ بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ایک درویش کچھ

نماز باجماعت + عرصہ حضرت کی خدمت میں رہا۔ لیکن متعدد بار اس نے مشاہدہ کیا کہ آپ بعض اوقات نماز کے لئے جماعت میں حاضر نہیں ہوتے۔ یہ بات اس درویش کے دل میں کھٹکتی رہی۔ یونہی کافی عرصہ گذر گیا ایک دن اس درویش کو ایک ویرانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اسے ایک دروازہ نظر آیا۔ وہ دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ تو وہاں ایک پر فضا باغ پایا۔ کچھ اور آگے بڑھا۔ تو دیکھا وہاں بہت سے لوگ ہیں۔ اور نماز باجماعت ہو رہی ہے۔ اپنی حیرت رفع کرنے کے لئے جب کچھ اور آگے گیا۔ تو عجیب حیران کن منظر نظر آیا۔ کہ حضرت شاہ کمال اس جماعت کی امامت فرما رہے ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر باہر نکل آیا۔ اور پھر دیکھا۔ تو نہ وہ دروازہ تھا۔ اور نہ وہ باغ۔ جو شبہ دل میں لاحق ہوا تھا۔ وہ یکسر نکل گیا۔

کرامتوں کے متعلق نظریہ + شیخ عبدالاحد سے نقل ہے کہ "باوجود اس کے

۱- زبدۃ المقامات

کہ حضرت شاہ کمال خوارق عادات میں بہت مشہور تھے۔ لیکن اگر وئی شخص آپ کے پاس اس نیت سے آتا۔ کہ آپ سے کسی کرامت کا مشاہدہ کرے۔ تو شدت سے ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا صالونی جو اعاظم علمائے عصر میں سے تھے۔ معہ اپنے تلامذہ کے مشاہدہ کرامت کی نیت سے آپ کے پاس آئے۔ آپ نے ان کے مقصود سے آگاہی پاکر شدید غیض و غضب کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اور شدت غضب میں فرمایا۔ " اے صالونی ! توکمال کی کرامات دیکھنے آیا ہے" ۔ چنانچہ وہ ہیبت زدہ ہو کر چلے گئے۔ "

گویا کہ کرامات کی جو طاقت حاصل تھی۔ وہ اس لئے نہ تھی۔ کہ لوگ اسے تماشہ بنالیں۔ اور محض دلگی کے لئے خوارق عادات طلب کریں۔ یہ جو کچھ تھا۔ وہ ایک خاص مقصد کے لئے تھا۔ جہاں اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہاں اس کا صدور بے ساختہ ہوتا تھا۔ اور بلا ضرورت کرامت کا اظہار بازیگری کے مترادف تھا۔ اسی لئے آپ مولانا صالونی پر برہم ہوتے کہ ان کی خواہش اور مطالبہ نازیبا تھا۔ اس واقعہ سے یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے۔ کہ اہل علم تک نے ولایت، کرامت جیسی ارفع طاقتوں کو محض کھیل تماشہ سمجھ رکھا تھا۔ اور یہ طاقتیں قدرت کی طرف سے جس مقصد کے لئے ودیعت کی جاتی ہیں۔ لوگ ان سے سراسر بے خبر تھے۔

ایک اور کرامت + شیخ عبد الاحد کے سبب چونکہ سرہند سے تو آپ کا تعلق قائم ہو ہی چکا تھا۔ مضافات سرہند میں ایک قصبہ پائل ہے۔ آپ اکثر وہاں بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ قیام پائل کے دوران میں آپ پر ذوق و حال کا غلبہ ہوا۔ معتقدین میں سے ایک کو ساتھ لیا۔ اور رات کے وقت سیر صحرا کے لئے باہر نکل گئے۔ اثناء راہ میں ایک تنور کے اوپر سے گذر ہوا۔ تو آپ نے ہمراہی سے دریافت کیا۔ کہ تمہیں تنور کے متعلق کچھ علم ہے۔ کہ اس میں کیا کچھ ہے؟ ہمراہی نے جواب دیا ! اسرار کا علم تو آپ ہی کو ہے" آپ نے فرمایا ! " کہ یہاں شہیدوں کا ایک گروہ مدفون ہے۔ کہ دن میں ہزار بار اللہ

تعالیٰ کی رحمت ان پر نازل ہوتی ہے لوگوں کو علم نہیں۔ اسی لئے۔ یہاں وہ خس و خاشاک ڈال دیتے ہیں۔ آہ! خاک ہند و پاک میں تبلیغ دین حنیفی کے لئے کیسے کیسے بندگان خدا نے اپنی جان شیریں کو قربان کیا۔ اور اپنے خون سے اس سرزمین کو لالہ زار بنایا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور آج ہمیں علم بھی نہیں کہ یہاں کے ہر ذرہ کے دامن میں کتنے گلبدن پنہاں ہیں۔

مسائل تصوف + تذکرہ حدیقۃ الخوارق میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ شیخ عبد الاحد سرہندی نے حضرت سید الاوتاد شاہ کمال قادری سے چند ایک مسائل تصوف کے متعلق استفسار کیا۔ سوال دریافت طلب یہ تھا۔ کہ محض حرف ذاتِ حق تعالیٰ واجب الوجود ہے اور مشائخ کبار کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ مجرد بغیر قلب ذات حق سبحانہٗ تعالیٰ حاصل ہو" اس پر آپ نے جواب دیا۔ کہ " ہمارے مشرب میں قرب حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خصوصیت حاصل ہے۔ اور جناب صدیق اکبرؓ کو یہی طریق تعلیم کیا گیا تھا۔ اور اس درویش کو جو کچھ حاصل ہے۔ وہ عین ذات ہے" اسی سلسلہ میں شیخ عبد الاحد نے دریافت کیا۔ "کہ جہاں تک حواس کا تعلق ہے۔ اس میں سبھی شامل ہیں۔ پھر ان کو یہ خصوصیت کیسے حاصل ہو۔ اس طرح پھر یہ لازم آئے گا۔ کہ وہ خواص کا درجہ حاصل کر لیں؟" آپ نے جواب دیا۔ " جو غیر مکون ہے۔ حواس سے اس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک اس کے ساتھ دوسری چیز شامل نہ ہو۔ مکون کا ادراک بھی ناممکن ہے۔ روایات میں مذکور ہے۔ کہ حضرت رسالت پناہیؐ کا قلب عین ذات بنا تو حضورؐ رویت سے مشرف ہوئے۔ اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قلب ان کا عین نہیں بنا تھا۔ تب تک وہ رویت سے مشرف نہ ہو سکے۔ اور انہیں لن ترانی کہہ کر روک دیا گیا" ۔ جناب عبد الاحد سے روایت ہے کہ حضرت استاذی مرشدی و مولائی نے اسی مسئلہ پر مزید روشنی ڈالی فرمانے لگے۔ " جب اللہ

تعالیٰ اپنے کسی بندہ پر لطف و کرم کرنا چاہتے ہیں۔ تو اسے اپنے نور سے منور کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اس تک رسائی حاصل کرے۔ اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ کسی اور چیز سے نہیں۔ "کالقلب و الروح والسر حالہ مقید۔ وادراک المطلق بالتقید محال"۔ اس میں ایک بڑا راز پوشیدہ ہے۔ کہ جس پر سے پردہ اٹھانا تکلم کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی تشریح کسی مجلس میں زبان ہی سے ادا کی جائے گی"۔ اس قسم کے استفسارات اور جوابات کا سلسلہ احباب کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ بعض اوقات مجالس میں زبانی اور بعض اوقات بذریعہ تحریر آپ جواب دیا کرتے تھے۔ لیکن یہ امر نہایت افسوسناک ہے۔ کہ آپ کی تمام تحریروں اور علمی نکات کو جو آپ نے مختلف مجالس میں بیان فرماتے سنجیدگی سے جمع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ میری دسترس میں آپ کے خطوط کا ایک نہایت مختصر سا مجموعہ ہے۔ جسے بطور ضمیمہ اس تذکرہ کے ساتھ شامل کیا جارہا ہے۔

اظہار کرامت سے ممانعت + اوراق ماسبق میں بیان کیا جاچکا ہے کہ اگرچہ آپ کثیرالخوارق تھے۔ اور یہ جذبہ آپ میں نہایت قوی تھا۔ جیسا کہ شیخ عبدالاحد سرہندی کے بیانات اور حضرت امام ربانی کے ملفوظات سے ظاہر ہے۔ لیکن ان خوارق کا ظہور بے ساختہ ہوا کرتا تھا۔ نہ کہ بتکلف۔ اور آپ اس امر کا خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ کہ آپ کے متعلقین ان طاقتوں کو جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم عطیہ تھیں بلا سبب اور غیر متعلق طریق سے استعمال نہ کریں۔ اور اسے اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ نہ بنالیں۔ چنانچہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جہاں کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آیا۔ تو آپ نے شدت سے اس کی مخالفت کی۔ اور ان لوگوں کو شدید زجر و توبیخ کی جن سے خوارق عادات کا ظہور ہوا۔ حتیٰ کہ ایسے معاملات میں آپ ادنیٰ سی فروگذاشت کو بھی گوارا نہیں کیا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ آپ کے متوسلین میں ایک صاحب شیخ اسحاق تھے۔ نواح ملتان میں ان کا قیام تھا۔ چونکہ آپ کی نگاہ کیمیا اثر کی تاثیر سے وہ مرتبہ کمال تک پہنچ چکے تھے۔ اس لئے خلق خدا ان سے اعتقاد کامل رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے ایک معتقد نے ان کی

دعوت کی۔ کھانے سے فراغت کے بعد انہوں نے مرغ کی ہڈیوں کو جمع کیا۔ اور کہا اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ ہڈیاں صحیح و سالم مرغ کی صورت میں تبدیل ہو گئیں۔ یہی شیخ اسحاق ایک مرتبہ مراقبہ میں بیٹھے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک شیر ان کی خدمت میں حاضر ہے۔ اور عجز و انکساری سے زمین بوسی کر رہا ہے۔ چنانچہ ان واقعات کا جب شیخ اسحاق سے ظہور ہوا تو ان کی شہرت بہت زیادہ ہو گئی۔ اور ان کی کرامتوں کے چرچے دور و نزدیک پھیل گئے۔ جب ان واقعات کا علم اعلیٰحضرت کو ہوا۔ تو آپ نے شیخ اسحاق کو اپنی خدمت میں طلب کیا۔ اور فرمایا کہ "شیخ اسحاق! ہماری ہدایت کے باوجود تم نے یہ روش کیوں اختیار کر رکھی ہے۔ یہ مرغ کو زندہ کرنا۔ اور شیر صحرائی کو اپنی خدمت میں رکھنا۔ شہرت طلبی کی تمنا میں کرامتوں کا اظہار کرنا۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟" شیخ اسحاق نے جواب دیا "کہ حضور! میں نے جو اتنی ریاضت کی۔ اور راہ سلوک میں بیشمار سختیاں برداشت کی ہیں۔ تو یہ اسی مقصد کے حصول کے لئے تھا"۔ یہ جواب قطعی خلاف توقع اور آپ کی روش کے منافی تھا۔ آپ کا عتاب اس کج فہم مرید پر نازل ہوا۔ اور نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مرشد والا تبار کی توجہات سے محروم ہو گیا۔ اور وہ تمام تصرفات جو روز بروز ترقی پذیر تھے۔ مائل بزوال ہو گئے۔ شکر نعمت یہ ہے کہ اس نعمت کو صحیح طریق سے تصرف میں لایا جائے۔ اس کے خلاف کیا جائے تو نعمت زائل ہو جاتی ہے۔ اور راہ سلوک میں تو ادنیٰ سی لغزش بھی نقصان عظیم کا باعث ہوتی ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور روایت ہے کہ قصبہ سنگڑھ کے ایک صاحب سید یوسف آپ کے مرید صادق تھے۔ ہر دم خدمت اقدس میں حاضر رہتے۔ اور ہر قسم کے فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔ اور بڑا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ ایک شب یہ ایک تنور کے قریب مراقبہ کناں تھے۔ صبحدم جب نانبائی تنور پر آیا۔ تو اس نے عجب تماشا دیکھا۔ کہ سید یوسف صاحب کا سر تن سے جدا ہے۔ اور تمام اعضا الگ الگ پڑے ہیں۔ نانبائی نے جو یہ نظارہ دیکھا۔ تو حواس کھو بیٹھا۔ اور چلانے لگا کہ " لوگو۔ دوڑو۔ سید یوسف کو کسی نے قتل کر ڈالا" ۔ لیکن اس کے بعد اس نانبائی اور دوسرے لوگوں نے جو وہاں

جمع ہو چکے تھے۔ اس سے بھی عجیب تر نظارہ دیکھا۔ کہ چشم زدن میں سید یوسف کے اعضا اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو گئے۔ اور سید یوسف صاحب مسکراتے ہوئے اٹھ کر چل دیے۔ اعلحضرت کو جب اس واقعہ کا علم ہوا۔ تو آپ نے سید یوسف کو طلب فرمایا۔ اور کہا" کہ اے مرد ناداں ! یہ کیا خفیف الحرکتی تھی۔ یہ نعمت جو تجھے حاصل ہوئی ہے۔ اس واسطے تو نہیں کہ تو اسے شہرت کا ذریعہ بنائے۔ اور اسے مفت و رائیگاں ضائع کرے"۔ اس خطاب عتاب آمیز سے ان حضرت کے حواس باختہ ہو گئے۔ دوسروں کا انجام دیکھ چکے تھے۔ فوراً قدموں میں گر پڑے۔ اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ آئندہ کے لئے ان حرکتوں سے توبہ کی۔ تب جا کر معافی ملی۔ گویا

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

بابا سیتل پوریؒ۔ کیتھل کے ایک ہندو فقیر بڑے درویش تھے۔ ہندی علوم میں دستگاہ تام رکھنے کے علاوہ استدراج و خوارق میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ ان کی ان کرامات کے سبب ایک خلقت ان کے گرد جمع رہتی تھی۔ اور یہ بھی گاہ بگاہ اپنے کمالات کے اظہار سے نہ چوکتے تھے۔ ایک دن شام کے وقت یہ تالاب کے کنارے اپنے کمالات روحانی کی نمائش میں مصروف تھے۔ اعلحضرت جہاں مقیم تھے۔ یہ تالاب عین اس جگہ کے پائین میں تھا۔ ایک ہی مرتبہ جو آپ نے توجہ کی تو یہ سب چوکڑی بھول گئے۔ اور سمجھ گئے کہ یہ جو طاقت سلب ہوئی ہے۔ یہ تو سب کچھ اس مرد بزرگ کی نگاہ عتاب کی صاعقہ ریزی ہے۔ اور یہی برق خاطف ہے جو سب کچھ اچک لے گئی ہے۔ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ دونوں ہی انکے لئے پریشان کن تھے۔ اپنی جگہ سے افتاں و خیزاں چلے اور اعلحضرت کے قدموں میں آن گرے۔ یہاں سے اظہار شفقت کے علاوہ آئندہ تشہیر خوارق کی ممانعت ہوئی۔ یہ جبتک جیے۔ اس ہدایت پر عمل پیرا رہے۔ اور ہمیشہ کے لئے اس در کی آستانہ بوسی کو اپنا شعار بنا لیا۔ بابا سیتل پوری ہندی زبان میں شعر کہا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے ملا ہے۔ درج کیا جاتا ہے۔

جن بٹھین تم جات ہوان بٹھین ہے دور
ست نام ستیل پوری جو سن مکھ رہے حضور

ان کی زندگی جس طرح عجیب تھی۔ موت اس سے بھی عجیب تر ثابت ہوئی۔ روایت ہے کہ جب انہوں نے وفات پائی۔ تو مسلمان کہتے تھے کہ ہم انہیں دفن کریں گے۔ کیونکہ یہ حضرت شاہ کمال کے حلقہ بگوشوں میں سے تھے۔ ہنود بضد تھے کہ ہم جلائیں گے۔ کہ یہ ہندو تھے۔ یہ نزاع اتنی بڑھی کہ دونوں گروہوں میں فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کشمکش میں آپ کی میت پر سے چادر اُتر گئی۔ تو سب کو نظر آیا۔ کہ لاش تو غائب ہے۔ چند ایک چنبیلی کے پھول پڑے مسکرا رہے ہیں۔ آدھے پھول مسلمان لے گئے اور لے جا کر دفن کر دیے۔ اور آدھے ہندوؤں نے شمشان بھومی میں جلا دیے۔ یہ حضرت شاہ کمال کے خوف سے اگر اپنی زندگی میں خوارق عادات سے باز آ گئے تھے۔ تو مرتے وقت اس کی کسر یوں پوری کر دی۔

فرزند اول:۔ بعینہٖ یہی واردات آپ کے صاحبزادہ اول حضرت شاہ عمادالدینؒ کے ساتھ پیش آئی۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ کنار دریا مصروفِ سیر تھے۔ سامنے ایک کشتی نظر آئی۔ دریا میں طوفان تھا۔ اور کشتی کمزور تھی۔ طوفان کے تھپیڑوں نے دیکھتے ہی دیکھتے کشتی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اہل کشتی نے یہ حالت دیکھ کر جزع و فزع شروع کر دی۔ اور درگاہ ایزدی میں الحاح و زاری کرنے لگے۔ آپ نے جو یہ کیفیت دیکھی۔ تو جذبات ترحم سے آپ بے قرار ہو گئے۔ اور اسی عالم میں کشتی اور اہل کشتی کی سلامتی کے لیے دست دعا بلند کیے۔ تیر نشانہ پر بیٹھا۔ دعا مقبول ہوئی۔ اور کشتی بعافیت کنارہ پر آ لگی۔ ہمراہیوں میں سے کسی نے یہ واقعہ حضرت کبیر ملک العشاق کی خدمت میں بیان کیا۔ اس پر آگاہی پاتے ہی آپ نے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ صاحبزادہ والا تبار کو خدمت اقدس میں طلب کیا۔ اور صورت واقعہ دریافت کی۔ جب انہوں نے بھی تصدیق کی۔ تو کم سے کم یہ سزا ملی۔ کہ آپ کو گھر سے نکل جانے کا حکم ملا۔ اگرچہ متوسلین اور معتقدین

پر اعلیحضرت کا یہ فیصلہ نہایت شاق گذرا۔ لیکن آپ کے رعب و ہیبت کا یہ عالم تھا۔ کہ کسی کو دخل اندازی کی جرات نہ ہو سکی۔ اور بلا چون و چرا شاہ عماد الدین گھر سے رخصت ہو گئے۔ والد بزرگوار کی توجہ و عنایات سے محروم ہو جانے کے بعد کہ وہ ہادی راہ سلوک بھی تھے وہ تمام کیفیات زائل ہو گئیں۔ کہ جن کی تجلیات کا عکس آئینہ دل کو منور کیے ہوتے تھا۔ اس واقعہ سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ بلند مقاصد پر نظر رکھنے والے عظیم المرتبت انسان علائق دنیوی کی زنجیروں کے پابند نہیں ہوتے۔ اہل و عیال اور مال و منال دو عظیم فتنے ہیں کہ جن کی کشش اکثر اوقات سالک کو راہ مستقیم سے پرے ہٹائے جاتی ہے۔ لیکن جو ان قیود سے آزاد ہو گئے۔ ان کی عظمت کے کیا کہنے۔ اپنے ایک مکتوب میں اسی نکتہ کی طرف اعلیحضرت نے روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اہل و عیال مانع فقر نہیں۔

ابجد عشقت چو بیا موختم:-
دیدہ زاغیار فرو دوختم

(ترجمہ:- جب میں نے عشق کا ابتدائی سبق پڑھا۔ تو غیروں کی طرف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں) اے فرزند! کار خاماں است کہ کے پندارد کہ فلاں درویش عیال بسیار دارد۔ وزنان کثیر۔ ایشاں بعیالے اطفالے مقید نیستند۔ چنانچہ دیگر عام خلق۔ اے فرزند! کار منتہا آنیست ہر چہ کہ عیال و اطفال زیادت باشد۔ مشغولی باحق کثارت پذیرد"

ترجمہ:- برخوردار! یہ نادانوں کا کام ہے۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ فلاں درویش کا کنبہ زیادہ ہے۔ اور عورتیں زیادہ ہیں۔ یہ لوگ کنبہ اور قبیلہ کے پابند نہیں ہیں۔ جیسا کہ عوام ہوا کرتے ہیں۔ برخوردار! صاحب کمال لوگوں کا یہ کام ہے کہ جس قدر اہل و عیال زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی مشغولیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

عجمی اقوام میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص یہ خیال شدت سے خیال پذیر تھا۔ کہ اہل اللہ کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ زن و فرزند سے عاری ہوں۔ اور دنیا کے تمام بندھنوں سے آزاد

جنگلوں اور پہاڑوں میں قیام پذیر ہوں۔ یہ نظریہ ہندی دیو مالا اور یہاں کے رشیوں منیوں کی روایات کے عین مطابق تھا۔ لیکن دین اسلام جو اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک یگانہ روزگار دین ہے۔ اور ادیانِ عالم سے قطعی متبائن اپنا ایک مخصوص نظام اور نظریہ حیات رکھتا ہے۔ اس کی تعلیمات کے قطعی منافی تھا۔ اس قسم کے خیالات کی تردید اور ان کی عملی مخالفت آپ جیسے مصلح کے لئے لازمی تھی۔ چنانچہ مکتوب میں اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

"از عیال و اطفال دور بودن و مجتنب گشتن کار جتدیان است۔

(اینان) یکطرفہ و یک لمحہ و یک لحظہ از خدا جدا نیستند۔ و دائم در مشاہدہ۔ ربانی و انوار رحمانی مستغرق و محواند۔

ترجمہ:۔ عیال و اطفال سے گریز اور ان سے پرہیز کرنا نادانوں کا کام ہے۔ یہ لوگ جنہیں اہل اللہ کہا جاتا ہے۔ ایک لمحہ بھی اللہ تعالیٰ سے دور نہیں ہوتے۔ اور ہر دم اس کے نظارہ میں غرق رہتے ہیں۔

حرف آخر کے طور پر شاعر مشرق کا یہ شعر یہاں کتنا صادق آتا ہے۔

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

لاریب وہ نفوس قدسی جو اس حقیقت کے معرفت شناس ہوتے۔ ستارے تک ان کے گرد راہ تک کو نہ پا سکے۔ طلب صادق کے راستوں میں جنہوں نے گام فرسائی کی اور حقیقت طلبی کے میدان میں جنہوں نے مردانہ وار قدم رکھا۔ زمین و آسمان کی پنہائیاں سمٹ کر ان کے آگے سرنگوں ہو گئیں۔ اور وہ ان بلندیوں پر پہنچے۔ کہ آج ہمارے تخیل کی رسائی بھی ان تک نہیں ہو سکتی۔

سیر روحانی:۔ تذکرہ حدیقۃ الخوارق کی ایک روایت سے اس سرنہاں کی کچھ جھلک نظر

آ سکتی ہے۔ مرقوم ہے کہ کھگا قوم کے ایک سردار شیخ جلال نامی حرمین شریفین کی زیارت کے ارادہ سے عازم سفر ہوئے۔ یہ شخص حضرت شاہ کمال صاحبؒ کے حلقہ بگوشوں میں ایک خاص اعتبار رکھتے تھے۔ بوقت رخصت عرض کرنے لگے۔ " کہ اس سفر میں اگر آپ بھی میرے ہمراہ ہوتے تو اس کی خیر و برکت ہزار گنا زیادہ ہو جاتی" ۔ آپ نے فرمایا! " کہ اگر یہ سعادت میرے مقدر میں ہوئی تو شاید میں بھی اس سے مشرف ہو جاؤں" ۔ چنانچہ شیخ جلال اس قیل و قال کے بعد اس مقدس سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب قطع منازل کے بعد قندھار پہنچے۔ تو اعلحضرت کو پہلے سے وہاں موجود پایا۔ حیرت و مسرت کے جذبات کے ساتھ شیخ جلال نے آپ کی دست بوسی کی۔ اور عرض کیا کہ " حضور! آپ یہاں مجھ سے پہلے کیسے پہنچ گئے۔ اور یہ مجھ سے علیحدہ سفر کرنے کا کیا سبب ہے؟" آپ نے فرمایا! " یہ باتیں سمجھنے اور سمجھانے کی نہیں ہیں" ۔ شیخ جلال قندھار سے نکلے تو اصفہاں پہنچے۔ وہاں بھی آپ کو قیام پذیر پایا۔ انہیں حیرت ضرور ہوئی۔ لیکن یارائے سوال نہ تھا۔ اصفہاں سے نکل کر جب عروس البلاد بغداد میں وارد ہوئے۔ تو وہاں بھی آپ کو موجود پایا۔ اور شیخ جلال کے مشاہدہ میں یہ عجیب بات آئی۔ کہ آپ وہاں کے لوگوں سے اس طرح مانوس تھے۔ گویا مدت سے یہ وہاں مقیم ہیں۔ انہوں نے جب آپ کی مجلس میں آنے والوں سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضرت شاہ کمال صاحبؒ تو ایک عرصہ سے ہمارے پاس ہی مقیم ہیں۔ جب یہ حجاز میں وارد ہوئے۔ تو وہاں بھی ہر مقام پر آپ کو پہلے سے موجود پایا۔ حتیٰ کہ اس مقدس سفر کی تکمیل کے بعد جب یہ وارد ہندوستان ہوئے۔ تو ملتان میں حضرت شاہ کمالؒ یوں ملے کہ گویا کبھی باہر گئے ہی نہ تھے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

موجودہ دور میں ان روایات کے قبول کرنے پر شاید ذہن آمادہ نہ ہوں لیکن کیا زمانہ ہر گھڑی منقلب نہیں؟ اور کیا زمانہ ہر آن نئے سے نیا روپ نہیں بدلتا۔ جو کل تھا۔ وہ آج نہیں۔ جو آج ہے

وہ کل نہ ہو گا۔ آج کی ایجادات و ترقیات جس طرح حیران کن ہیں اس دور میں روحانیت کی یہ کیفیت کیوں ہمارے لئے قابل قبول نہ ہو۔

کیتھل میں مستقل قیام فرمانے کے بعد بھی سیر و سیاحت کا ذوق آپ کے دل میں موجود رہا چنانچہ مختلف تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ آپ نے کیتھل میں مستقبل اقامت اختیار کرنے کے بعد دہلی۔ آگرہ۔ گجرات۔ احمد آباد وغیرہ کے سفر کیئے۔ پائل اور سرہند سے تو آپ کو دلی انس تھا۔ کہ اکثر و بیشتر وہاں تشریف لے جایا کرتے اور دیر تک قیام فرمارہتے۔ لاہور۔ پاکپتن۔ ملتان ۔ دیپالپور اور قصبہ قبولہ آپ کے قدوم مئیمنت لزوم سے کئی مرتبہ مشرف ہوئے۔ آپ کو کیتھل میں مستقل اقامت اختیار کیئے اب طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ اور عوام و خواص میں سے کثیر تعداد آپ کی حلقہ بگوش ہو چکی تھی۔ لیکن آپ کی مجلس میں جو قرب شیخ عبد الاحد سرہندی اور شیخ جلال الدین تھانیسری کو حاصل ہوا۔ وہ کسی اور کو میسر نہ آیا۔ یہ بزرگ اپنی علمی فضیلت اور روحانی بصیرت کے سبب اعلحضرت کے نزدیک درجۂ محبوبیت رکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ صاحب کے ساتھ مجالس میں زبانی بھی گفتگو ہوتی تھی۔ اور سلسلہ خط و کتابت بھی جاری رہتا تھا۔ کہ جن میں تصوف کے نکتہ ہائے غریب اور سلوک و معرفت کے عقدہ ہائے غریب وا ہوتے تھے۔

شیخ عبد الاحد صاحب چونکہ آپ کی مزاج شناسی اور مرتبہ دانی میں مہارت تام رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی ہر ادا آپ کے نزدیک مقبول و محبوب تھی۔ اور ان کے ہر سوال کا جواب خندہ پیشانی سے دیا جاتا تھا۔ جو بلاشبہ دیگر احباب کے لیے بھی ارتقائے روحانی کا سبب ہوتا تھا۔ اور آج کے دور میں بھی ان کی افادیت مسلم ہے۔

شجرہ جدی کی نسبت

شیخ عبد الاحد رحمہ کا استفسار

ایک مرتبہ شیخ عبد الاحد جب حاضر خدمت ہوتے تو دیکھا کہ آپ نہایت خوش وقت اور شگفتہ رو بیٹھے ہیں۔ تو بے تکلف عرض کیا۔ "کہ حضور! یوں تو اس خادم درگاہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ دودمان غوثیہ کے چشم و چراغ ہیں۔ اور خاندان سادات حسنی کے قافلہ سالار ہیں۔ لیکن حضور کے شجرہ جدی سے بندہ درگاہ کو آگاہی نہیں ہے۔ اگر اس پر کچھ روشنی ڈال دی جائے۔ تو نہ صرف میرے لئے بلکہ تمام حلقہ بگوشان سلسلہ کے لیے مفید و نافع ہو گا۔"

اس سوال پر آپ نے فرمایا! "اے عزیز محترم! آپ جیسے حقیقت آگاہ لوگوں کا اس قسم کی باتوں کی ٹوہ میں لگنا نہایت حیرت انگیز ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ فقیروں کے مذہب میں حسب و نسب پر توجہ کرنا خودی و خود پرستی کے مترادف ہے۔ حالانکہ قافلہ سالار انسانیت حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بلاشبہ سید اولادِ آدمؑ تھے۔ اپنے آپ کو زمرہ مساکین میں شامل کیا ہے۔ ہماری کیا ہستی ہے کہ نام و نسب کو فخر کا سبب بنائیں۔ اور بیان کرتے پھریں کیا یہ نہیں سنا۔

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لیکن جناب شیخ نے جب اس سلسلہ میں زیادہ اصرار کیا۔ اور نہایت عجز و انکساری کے ساتھ کئی مرتبہ عرض کیا۔ تب آپ نے اپنا شجرہ جدی بیان کیا۔ (جو کہ اولین اوراق میں درج ہو چکا ہے۔ اور فرمایا کہ " بارھویں پشت میں میرا سلسلہ نسب سیدنا عبد القادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے۔ اور یہ جو خرقہ میرے زیب تن ہے۔ حضرت پیران پیرؒ ہی کا ہے۔ جب سے میں وارد ہند ہوا ہوں۔ تب سے میں نے کبھی کسی سے اپنا حسب نسب بیان نہیں کیا۔ آج آپ کے اصرار کے سبب یہ بیان کیا گیا۔" جناب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کل مجد بجد لا بجد۔ (ترجمہ:- تمام بڑائی ذاتی محنت اور کمال پر منحصر ہے نہ کہ نسل پر)

ہنر سے خالی اور کسی قسم کے کمال سے بے بہرہ لوگوں کیلئے آپؒ کے ارشادات میں کتنا بڑا سبق پنہاں ہے۔ کہ جو محض اس سبب سے کہ کسی اچھے خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ اپنی دو کان ہمیں لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اسلاف کی قبروں کے مجاور بن کر استخواں فروشی کرتے ہیں۔ ان بندگان حرص وہوا اور اسیران دامِ کبر وریا سے کوئی پوچھے۔ کہ تم جو اسلاف کے کارناموں پر اتنے مغرور ہو۔ بتاؤ تو سہی تمہارے دامن عمل میں بھی کوئی سرمایہ فخر ہے؟ اس زمرہ میں وہ تقدس فروش بھی نظر آتے ہیں کہ جو عوام کی سادہ لوحی سے پورا فائدہ اٹھاتے اور بے خوف و خطر ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ لوگوں کی محنت کا ثمر بلا زحمت حاصل کرنے اور بے غل و غش اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ دین و دنیا میں رہنمائی کے یہ مدعی بظاہر دو عالم سے بے نیاز رہتے ہیں۔ لیکن ہر لحہ دنیا طلبی میں اسیر رہتے ہیں۔

مقام درویشی کی تعریف:۔ اعلٰحضرت مقام درویشی کی تعریف اپنے ایک مکتوب میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

قدم اول:۔ آنانکہ فقر اختیار کردند۔ بعشق مولیٰ مردہ اند۔ و فقر و غنائے ایشاں نیستی و ہستی دنیا را نیست کرد۔ غبار دنیا دامن ہمت ایشاں را ہرگز نہ گیرد۔ و ایناں بعشق مولا خانماں و مال و منال ہمہ باختہ اند۔ ایں اول قدم ایشاں است۔

ترجمہ:۔ جنہوں نے فقر اختیار کیا۔ انہوں نے عشق مولا میں جان دے دی۔ ان کے فقر و غنا نے دنیا کی موجودات کو موہوم بنا دیا۔ متاع دنیا کا غبار ان کا دامن گیر نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے عشق مولا میں سب کچھ لٹا دیا۔ درویشی کی راہ میں یہ اول قدم ہے۔

حضرت شاہ کمالؒ کے زمانہ میں بھی ایسے مدعیان فقر و غنا موجود تھے۔ کہ جو دین کے ذریعے دنیا حاصل کرتے تھے۔ اور فقیری و درویشی کا روپ دھار کر عوام میں گمراہی پھیلاتے تھے۔ درویشی و فقیری کے متعلق عجیب عجیب مطالب انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔ جنہیں بزعم خود طریقت و تصوف

کا نچوڑ تصور کرتے تھے۔ ادھر دیکھئے ایک عاشق مولا کے حقیقی جذبات کہ ان سے ایمان کا نور کس طرح پھوٹا پڑتا ہے۔ اسی مکتوب میں فقر و درویشی کی راہ میں دوسرے قدم کی تعریف کرتے ہوئے اعلحضرت فرماتے ہیں:-

دوئیم قدم آنست۔ کہ خود را و ہستی خود را برباختند و بے خود میزیید۔ و بخود مردہ اند۔ واز مولیٰ زندہ اند۔

ترجمہ:- (راہ فقر میں) دوسرا قدم یہ ہے۔ کہ (فقر کا مدعی) اپنی ہستی کو برباد کر دے۔ اور بیخودانہ زندگی بسر کرے۔ اپنی طرف سے مرجائے۔ لیکن خالق کی طرف سے زندہ رہے۔ درویشی و فقر کی منزل کا راہرو وہ ہے۔ جو اپنی خواہشات و جذبات کو قطعاً ترک کر دے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کے احکام کی تکمیل میں۔ یہاں تک چاق و چوبند ہو۔ کہ ایک لمحہ کی غفلت بھی اسطرف سے گوارا نہ کرے۔ دین اسلام کی حفاظت و حیانت احکام خداوندی کی تعمیل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ترویج کا فریضہ ادا کرتے ہوئے جو کچھ بھی پیش آئے۔ اپنی طرف سے مُردہ اور اللہ کی طرف سے زندہ ہو۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ اس راہ پر چلتے ہوئے اپنی ذات کو مطلقاً دھیان میں نہ لائے۔ جو لمحہ زندگی کا بسر ہو وہ پروردگار کی رضا جوئی ہی میں بسر ہو۔ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا ہے۔ وہ مومن کے مقام کی کیسی سادہ مگر کتنی بلیغ تشریح ہے۔

دنیا فریب درویش:- ایک مکتوب میں ایسے دنیا فریب درویشوں کی نشاندہی یوں کی ہے۔ جو درویشی کے دعویدار ہیں۔ لیکن در حقیقت پکے دنیا دار ہیں۔

حالا مردمان، درویشان و سالکاں پیدا شدہ اند کہ خود را شیخ یُحیی و یُمیت میگویند۔ و در بدر مخلوق می گردند۔

ترجمہ:- اس زمانہ میں درویش اور فقیر کے روپ میں ایسے آدمی موجود ہیں جو حیات و ممات میں تصرف کے دعویدار ہیں۔ اور دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

مرتبہ انسانیت:- مشہور ہے کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا اس کے بارہ میں اعلحضرت نے جو تشریح فرمائی ہے۔ وہ بلاشبہ عالم انسانیت کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا سبق ہے۔ درویشی اور فقیری کا درجہ تو بہت بلند ہے۔ پہلے انسان کو درجہ انسانیت تو میسر آتے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔ اور خطاب انہیں شیخ عبدالاحد سے ہے۔ جن کے گھر سے وہ آفتاب ولایت طلوع ہونے والا تھا۔ جسے دنیا امام ربانی مجدد الف ثانی کے نام سے پکارتی ہے۔

"انسان آں را گویند۔ کہ از خود رستہ و از جمیع دامہا گذشتہ و بحق پیوستہ و از جمع تفرقہ گذشتہ۔ از خود فانی و بحق ہمزبانی داشتہ باشد۔ شربت موت انت موتو چشیدہ و آتش عشق در دل افروختہ باشد۔ و آنچہ غیر حق است سوختہ باشد۔ عدناً وجود لہٗ۔ ہر طرف سرچہ بیند فاینما تولوا فثم وجہ اللہ پندارد۔

ترجمہ:- انسان کہلانے کا حقدار وہ ہے کہ جو اپنے نفس کے دام سے آزاد ہو۔ پروردگار سے وابستہ ہو۔ سود وزیاں سے بے نیاز۔ اپنی طرف سے مانند مردہ بے پروا اور اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز رکھتا ہو۔ موت سے قبل موت کا مزا چکھا ہو۔ دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑکتی ہو۔ ماسوا اللہ کے خس و خاشاک کو اُس نے جلا دیا ہو۔ جدھر منہ پھراتے۔ اسے اللہ ہی کا جلوہ نظر آتے۔

یہ ہے وہ درجہ انسانیت کہ جس پر یہ کارواں سالار عشق خود بھی فائز تھے۔ اور دوسروں کو اس مقام پر متمکن دیکھنے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ جن کی زندگی کا مقصد دوسروں کی اصلاح ہو تو پھر اس میں یہ صفات تو بدرجہ اتم موجود ہونی چاہئیں ایسی پیری مریدی کے آپ شدت سے مخالف تھے۔ کہ جس کے ذریعے پیر فقط جاہ و جلال اور مال و منال حاصل کرنے کی سعی کریں۔ یحییٰ منیریؒ اور حضرت خواجہ اجمیری کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ می گویند کہ یک زمانہ چناں پیدا خواہد شد۔ کہ مریداں را خواہند ساخت از برائے دنیا کہ از ایشان زر و سیم بدست آید۔

ترجمہ:- شیخ شرف الدین یحییٰ منیری فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ پیر اس لئے

لوگوں کو مرید کرینگے (کہ دنیا اور زرو سیم ہاتھ آئے۔)

اس زمانے میں تو خیر یہ کاروبار ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر چکا ہے جو شخص جتنا زیادہ چالاک ہو گا۔ اتنا ہی اس کا کاروبار کامیاب ہو گا۔ اس زمانے میں بھی گویا ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ اس گروہ کی اصلاح اور تنبیہہ مقصود ہے۔ فرماتے ہیں:۔

بیعت کرنا:۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ می فرمایند۔ جز سالک مجذوب کہ جذبہ ربانی برو تافتہ و اسرار الٰہی شناختہ باشد مرید کردن او را حرام است۔

ترجمہ:۔ حضرت معین الدین اجمیریؒ فرماتے ہیں کہ سالک مجذوب کے سوا اور لوگوں کو کہ جن کے دلوں پر انوار الٰہیہ کا انعکاس نہ ہوا ہو اور اسرار الٰہی سے بے بہرہ ہوں مرید کرنا حرام ہے۔

آج تو خیر زمانہ ہی بدل چکا ہے۔ اس زمانہ میں بھی چند ایک ہی تھے۔ جو ان اصولوں پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ مقام انسانیت کی حقیقت اور معرفت نفس کی وضاحت جو آپؒ فرمائی ہے۔ بلاشبہ وہ اہل بصیرت کے دیدہ و دل کیلئے کحل البصر کا حکم رکھتی ہے۔ اب ذرا وہ اصول بھی ملاحظہ ہوں۔ جو آپؒ نے معرفت الٰہی کیلئے وضع فرمائے ہیں۔ اور جن پر عمل پیرا ہوئے بغیر کوئی سالک اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ ایک مکتوب میں آپؒ لکھتے ہیں:۔

معرفت الٰہی:۔ "شرائط لابدی این است۔ اول عقل و بلوغ۔ دوئم علم شریعت بمقدار حاجت۔ سوئم ترک دنیا باطنا" و ظاہرا"۔ اگر میسر نشوید۔ باطن البتہ شرط است۔ چہارم ارادت آوردن' و منسلک شدن بہ شیخ کہ محقق و مسلسل باشد۔ مطابقت او سوئے سید البشر علیہ السلام۔ پنجم مجاہدہ کہ موافق شرع باشد"

ترجمہ:۔ معرفت الٰہی کے حصول کیلئے یہ شرائط لازمی ہیں۔ اول عاقل و بالغ ہونا۔ دوسرے ضروری علم شریعت۔ تیسرے ظاہری اور باطنی طور سے دنیا کو ترک کرنا۔ ظاہری طور سے اگر ترک دنیا میسر نہ ہو تو باطنی طور سے لازمی ہے۔ چہارم ایسے مرشد سے ارادت و عقیدت کہ جو شریعت کی پیروی اور سنت نبوی ﷺ پر مکمل طور سے عمل پیرا ہو۔ پانچویں مجاہدہ جو شریعت کے مطابق ہو۔

یہ تھی وہ تعلیم جس کی بنیاد آپؒ نے یہاں آکر رکھی۔ مخالفت اور دشواریوں کا سامنا آپؒ کو بھی کرنا پڑا۔ جیسا کہ ہر مصلح کو کرنا پڑتا ہے لیکن کامیابی انہی صاحب عزم بزرگوں کے قدم چومتی ہے۔ جو ان دشواریوں کو پروا کئے بغیر اپنے موقف کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ اس سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد حضرت شاہ کمالؒ کو وہ سب کچھ پیش آیا۔ جو کہ لازمی و لابدی تھا۔ لیکن بہر حال جو مقصد آپؒ کے مدنظر تھا۔ وہ کبھی بھی آپؒ کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا۔ کیتھل میں مقیم ہوئے آپؒ کو طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ مخالفت اور موافقت کی تمام راہیں متعین ہو چکی تھیں۔ آپؒ جس مدرسہ فکر کے بانی تھے۔ جب اس کی بنیادیں استوار ہو گئیں۔ اور آپؒ کو شیخ عبدالاحد سرہندیؒ۔ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ قاضی عبدالرحمٰنؒ، حضرت شاہ قمیص الاعظم سادھورویؒ جیسے ہمنوا اور اسی قبیل کے دوسرے رفیق میسر آگئے۔ تو آپؒ نے اپنے ذاتی معاملات کی طرف توجہ دی۔

اولاد امجاد:۔ حضرت شاہ کمال قادری کیتھلیؒ کی زوجہ اول حضرت عائشہؒ سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ انؒ کے انتقال کے بعد آپؒ کی دوسری شادی ہوئی جن سے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ فرزند اول شاہ عمادالدینؒ فرزند دوم ابوالمکارم شاہ موسیٰؒ اور فرزند سوم شاہ نور الدینؒ

صاحبزادہ اول:۔ کیتھل میں زمانہ قدیم سے سادات ترمذی کا ایک معزز خاندان آباد تھا۔ جو ان تمام خصوصیات سے بہرہ ور تھا۔ جو بلند مرتبہ خاندانوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ صاحبزادہ اول حضرت شاہ عماد الدینؒ کا عقد نکاح سید علی اکبر ترمذیؒ کی صاحبزادی سے ہوا۔ لیکن جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ شاہ عماد الدینؒ والد محترم کے عتاب کا شکار ہوئے۔ اور اس مناکحت پر دو سال بھی نہ گزرے تھے۔ کہ انہیںؒ اپنا گھربار اور اہل و عیال چھوڑ کر جانا پڑا۔ اور جب تک حضرت شاہ کمالؒ بقید حیات رہے۔ یہ کیتھل میں نہ آئے۔ ان کے متعلق مرقوم ہے کہ والد بزرگوار کے عتاب کے بعد یہ ملک دکن کی طرف چلے گئے۔ اور جب واپس آئے تو اعلیٰ حضرتؒ کو وفات پائے ایک سال گزر چکا تھا۔ آپؒ بھی یہاں آنے کے بعد فقط دو سال زندہ رہے۔ آپؒ کا سن وصال 985ھ ہے۔

صاحبزادہ دوم :- فرزند دوم ابو المکارم شاہ موسیٰ کو ابتدا ہی سے سیاحت کا شوق تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ تن تنہا عازم بغداد بھی ہو گئے۔ لیکن چونکہ پدر بزرگوار کی اجازت کے بغیر یہ سفر اختیار کیا تھا۔ آدھا راستہ بھی طے نہ کر پائے تھے۔ کہ شدید علالت سے دوچار ہوئے۔ وہاں بھی اسی رہنمائے دین و دنیا کی معاونت نے کام کیا۔ یعنی عین عالم کرب میں آپ کی صورت نظر آئی۔ فرمانے لگے۔

"اے موسیٰ! بغیر اجازت کے یہ سفر کیا معنی؟" یہ اپنی علالت کے باعث شدت سے پریشان خاطر تھے۔ چنانچہ طالب معافی ہوئے۔ اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے رو بصحت ہونے لگے۔ جب مکمل صحت ہو گئی۔ تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ معمولی سرزنش ہوئی۔ لیکن جب انہوں نے عجز و انکساری کے ساتھ اپنے ذوق سیاحت کا ذکر کیا۔ اور آپ نے بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری جانا۔ تو انہیں کوٹ قبولہ میں مستقل اقامت اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی چنانچہ یہ قبولہ میں تشریف لے آئے۔

قبولہ :- یہ تاریخی قصبہ سلطان غیاث الدین تغلق کے حکم سے اس علاقہ کے امیر نے آباد کیا تھا۔ جس کا نام ملک قبول خاں تھا۔ جب یہاں قلعہ اور محلات تعمیر ہو چکے۔ اور آبادی کا عنوان قائم ہو گیا۔ تو حاکم علاقہ نے اپنے نام ہی پر اس کا نام کوٹ قبولہ رکھا۔ اور یہاں پر سورج بنسی خاندان (راجپوت) کے ایک قبیلہ کو آباد کیا۔ جو اسلام قبول کرنے کے بعد ڈھڈی کہلاتا تھا۔ چنانچہ جب ابو المکارم حضرت شاہ موسیٰؒ یہاں تشریف لائے۔ تو یہی قوم اس علاقہ پر حاکم اور برسر

اقتدار تھی ۔ اسی قوم کے بیشتر افراد نے آپ کی سیادت و قیادت قبول کر لی ۔ اور رشتہ عقیدت میں منسلک ہو گئے ۔ لیکن چونکہ رتبہ امارت پر فائض تھے ۔ اس لیے اس تمکنت سے خالی نہ تھے ۔ جو دولت و ریاست کا خاصہ ہے ۔ چنانچہ ان لوگوں نے کئی مرتبہ اس شاہ فقر و غنا کے سامنے اس قسم کی بڑائی کا مظاہرہ کیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ آپ کی نگاہ لطف ان لوگوں کی طرف سے پھر گئی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکل گیا یعنی جب جلال الدین اکبر بادشاہ برسر اقتدار آیا ۔ تو اس نے قوم ڈوڈی کو اس علاقہ سے بے دخل کر دیا ۔ اور قاضی خیر الدین کو یہ پرگنہ بطور جاگیر دے دیا ۔ قیاساً کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ۹۶۷ھ یا ۹۶۸ھ میں پیش آیا ہو گا ۔ قاضی صاحب عالم بیعدیل تھے ۔ انہیں حضرت شاہ موسیٰؒ سے گہری عقیدت تھی ۔ ان کے بعد ان کا خاندان صدیوں تک اس علاقہ پر قابض رہا ۔ اعلحضرت جب قبولہ تشریف لائے تو قاضی خیر الدین یہاں برسر اقتدار تھے ۔ وہ اپنے علم و فضل اور زہد و عبادت و ریاضت کے سبب بہت جلد اعلحضرت کے مقربین میں شامل ہو گئے ۔ اور بہت ممکن ہے کہ اعلحضرت کے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہ بھی کیتھل گئے ہوں ۔ یوں حضرت اقدس انہیں یاد رکھتے اور خطوط میں سلام و دعا لکھا کرتے تھے ۔

جب حضرت شاہ موسیٰ قبولہ متمکن ہوئے تو سیر و سیاحت کا ذوق بھی پورا کرتے رہتے تھے ۔ جب یہاں رہتے کافی عرصہ گذر گیا ۔ تو کیتھل میں ان کی طلبی ہوئی ۔ اور سید عابد کی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا ۔ یہ بزرگ بھی ترمذی خاندان ہی کے چشم و چراغ تھے ۔ اور سادات بیرون حصار کہلاتے تھے ۔ لیکن قبولہ میں آنے کے بعد کچھ عرصہ بعد ان کی زوجہ محترمہ کا انتقال ہو گیا ۔ علائق دنیوی میں اس قسم کا رشتہ و پیوند سب سے کڑی زنجیر ہے ۔ چنانچہ اس زنجیر کا ٹوٹنا تھا کہ آپ پر وہی قدیم شوق سیاحت غالب آ گیا اور آپ شمالی پنجاب کی سیر کو نکل گئے ۔ وہ پر پرواز جو نکاح کے بعد ایک گونا کند ہو گئے تھے ۔ اب فضائے بسیط میں تیرنے کے لئے آزاد تھے ۔ آزادی و آزادروی جو قدیم سے عاشقان صادق کا دستور ہے ۔ انہیں یہ تعلقات کبھی بھی راس نہیں آتے ۔ اور اگر کبھی انہوں نے اس آلودگی میں قدم رکھا بھی تو یوں کہ کبھی بھی وہ ان کے مشاغل میں حارج نہ

ہوئی۔

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
بہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

ماں باپ، بہن بھائی اور اہل و عیال کی محبت کہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ ان حضرت کے حالات کا مشاہدہ کیجئے تو یوں نظر آتا ہے گویا ان کے دل پر اس کا ادنی سا بھی اثر نہیں۔ شاید دل پر انوار الٰہی کی تجلیات کے انعکاس کے بعد پھر کسی اور جذبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ عالم لاہوت کی رعنائیوں کا مشاہدہ کرنے والے اس عالم سفلی کے دامن تذویر میں کیسے اسیر ہو سکتے ہیں۔

قبول آنے کے بعد آپ کا یہ عالم تھا۔ کہ والد بزرگوار بار بار انہیں کیتھل میں طلب کرتے ہیں اور یہ جانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس گریز و فرار میں غالباً یہ سبب بھی شامل تھا کہ اعلحضرت کا دبدبہ و ہیبت اتنا شدید تھا۔ کہ ان کا سامنا کرتے ہوئے ہر اک کی روح کانپتی تھی۔ چونکہ یہاں بعض اوقات ادنیٰ سی فروگذاشت بھی بڑی تعزیر کا سبب بن جاتی تھی۔ وہ مکتوب جو حضرت اقدس نے انہیں لکھے ان سے اس طلب و شوق کا کچھ احوال ظاہر ہوتا ہے۔ جو ان کے دیدار کے لئے انہیں بے قرار کیے رکھتی تھی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

اماں ایں جا ہم آمدہ روز دو سہ چار ماندہ ہر چند کہ خوشی شما باشد۔ وشمارا کسے مقید نمی کند۔ دوستانِ خدارا مطلق کردن در کدام مذہب است کہ ایشاں بے قید اند؟

ترجمہ:- لیکن یہاں آؤ۔ دو تین یا چار دن جتنا تمہارا دل چاہے رہو۔ تمہیں کوئی پابند نہیں کرے گا۔ اللہ کے دوستوں کو پابند کرنا کسی بھی مذہب میں روا نہیں۔ چونکہ وہ تو آزاد ہیں۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں۔

لیکن دریں جا والدہ و برادر و خواہر اشتیاق ملاقات ایشاں کمال دارند۔ البتہ یک مرتبہ آمدہ دیدار خود نمودہ باز بروند۔ کہ دریں جا ہیچ قید نیست

باللہ العظیم ثم باللہ العظیم

ترجمہ :۔ یہاں تمہاری والدہ، بہن بھائی تمہاری ملاقات کے شوق میں بے قرار ہیں۔ ایک دفعہ تو ضرور آؤ۔ اپنا چہرہ دکھاؤ۔ چاہے پھر چلے جانا۔ کہ یہاں پر تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ حضرت شاہ کمال کو خوب معلوم تھا۔ کہ یہ حضرت کچھ خوفزدہ بھی ہیں۔ اور آپ کی طبعیت کے جلال سے گریزاں ہیں۔ چنانچہ اس طرف سے بھی کئی مرتبہ اطمینان دلایا گیا۔ ان کے عقد ثانی کی بھی فکر تھی۔ لیکن یہ اس قید سے گھبراتے تھے۔ لیکن پدر بزرگوار کا طلب و اصرار جب حکم کی حد تک پہنچ گیا۔ تو پھر انہیں بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور دوسری مرتبہ آپ کا عقد نکاح اسی علاقہ قبولہ کے ایک معتدر بزرگ سید جلال الدین کی صاحبزادی سے ماہ جمادی الاول ۹۸۰ھ میں ہوا۔ یہ سید جلال الدین حضرت اقدس سے عقیدت تام رکھتے تھے۔ اور اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ جب آپ نے اس رشتہ کو منظور فرمایا۔ تو یہ شرط رکھی کہ زوجہ محترمہ سیم و زر کی قسم سے کوئی چیز ہمراہ نہ لائیں۔ لیکن سسرال والوں نے اس ہدایت پر عمل نہ کیا۔ اور دستور کے مطابق سونا چاندی آپ کی زوجہ محترمہ کو دیدیا۔ جب آپ حجلہ عروسی میں تشریف لائے۔ تو کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اور فرمانے لگے۔ کہ نہایت ناگوار بو آرہی ہے۔ آخر زیادہ تجسس کیا تو وہ متاع دنیوی مل گئی۔ جس سے آپ متنفر تھے۔ جب اسے باہر پھنکوا دیا۔ تو آپ اطمینان سے بیٹھ سکے۔ یہ تھی شان اس برگزیدہ بارگاہِ جلال کی۔ کہ جن اشیاء کی فراہمی دنیا دار تو کیا دیندار تک بھی اپنا جزو ایمان سمجھتے تھے۔ انہیں ان چیزوں سے کراہت آتی تھی۔ "الدنیا جیفتہ والطالبہ کلاب" پر کتنا صحیح عقیدہ اور کیسا محکم عمل تھا۔ آپ کی وفات ۲۵ رمضان ۹۸۶ھ میں ہوئی۔ اور قبولہ ہی میں آپ کی تدفین ہوئی۔ معتقدین نے آپ کی تربت پر شاندار روضہ تعمیر کیا۔ جو بلاشبہ اسلامی فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ یہ مزار ۹۹۹ھ میں مکمل ہوا۔ آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں اور تین صاحبزادے۔ دو صاحبزادے تو صغر سنی میں وفات پا گئے۔ فرزند اول شاہ افضل سے آپ کی نسل چلی۔ جو قبولہ اور اس کی نواح میں آباد ہے۔ قبولہ ان دنوں تحصیل پاکپتن کا ایک قصبہ ہے۔ اور

اس شاہراہ پر واقع ہے جو ساہیوال (منٹگمری) سے بہاولنگر کو جاتی ہے۔ آثار قدیمہ میں سے قلعہ کا ایک برج اور فصیل کا ایک حصہ باقی ہے۔ حضرت ابوالمکارم شاہ موسٰی کا مزار برلب شاہراہ زائرین کے دیدہ ودل کیلئے روشنی مہیا کرتا ہے۔ آپ بہت عمدہ شاعر تھے۔ آپ کا مختصر سا دیوان موجود ہے جو زیر طبع ہے۔

قطب الاقطاب حضرت شاہ سکندر رئیس الاولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ۔

ولادت :۔ حضرت شاہ کمالؒ کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ اول بی بی صالحہ ۔ دوم شاہ خاتون سوم بی بی جمال۔ ان تینوں صاحبزادیوں کی شادی کیتھل کے ترمذی خاندان ہی میں ہوئی۔ اعلٰحضرت کے تیسرے صاحبزادے شاہ نورالدین ابھی کمسن تھے کہ وفات پا گئے۔ اب ہم پھر کیتھل چلتے ہیں۔ اور اس دربار گہربار کی حالت دیکھتے ہیں۔ جہاں فی الحال سکوت و سکون کا عالم طاری ہے۔ صاحبزادہ اول شاہ عمادالدینؒ معتوب ہو کر وہاں کے افق سے غائب ہو چکے ہیں۔ صاحبزادہ دوم حضرت شاہ موسٰیؒ کو ولایت قبولہ مل گئی۔ خدام بارگاہ ششدر و پریشاں ہیں۔ اندر کی رونق اور باہر کی تازگی ختم ہو گئی ہے۔ ہر طرف ایک ویرانی اور سناٹے کا عالم ہے۔ لیکن نہ کسی مرید کو یارائے سوال اور نہ کسی مقرب کو بولنے کی مجال۔ آخر ایک دن جناب شیخ عبدالاحد نے اس عالم پریشانی کو ظاہر کر ہی دیا۔ کہ جس کا سب کو احساس تھا۔ لیکن زبان پر لانے کی جرات نہ تھی۔ حضرت اقدس نے فرمایا۔ کہ پریشان نہ ہوں۔ وہ بدر منیر عنقریب طلوع ہونے والا ہے جس کی تابانی و درخشانی سے یہ درو دیوار جگمگا اٹھیں گے۔ اور یہ سب اداسیاں مبدل بہ راحت ہو جائیں گی۔

چنانچہ آپ کی یہ بشارت پوری ہوئی۔ اور شاہ عمادالدین کی زوجہ محترمہ کے بطن سے (جو کیتھل ہی میں تھیں) ۹۵۹ھ میں فرزند ارجمند کی ولادت ہوئی۔ اور واقعی وہ خانہ ویران کہ جہاں خاموشی کا راج تھا۔ وہاں سے اب دن رات مسرت و شادمانی کے ترانے بلند ہونے لگے۔ محترم دادا نے ان کا نام شاہ عبداللہ سکندر تجویز کیا۔ لیکن جب آپ کے کمالات کی تابانی درخشاں ہوئی۔ تو زمانہ نے آپ

کے سر پر رئیس الاولیائی کا تاج رکھا۔ اور آپ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔ گویا آپ کا پورا نام شاہ عبد اللہ سکندر روس الاولیا۔ ہے۔ آپ نے ذرا ہوش سنبھالا۔

تو محترم دادا نے آپ کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا۔ فاضل وقت اساتذہ نے آپ کی تعلیم کا فریضہ سنبھالا۔ اور آپ کے شب و روز ترقی و کمال کے حصول میں گذرنے لگے۔ روحانی تربیت کے ذمہ دار ان کے محترم دادا حضرت شاہ کمال قادری تھے۔ اور علوم ظاہری کی تکمیل اساتذہ وقت کے ذریعہ ہو رہی تھی۔ گویا در نایاب صدف کے ان دونوں پردوں میں محفوظ جلا و درخشانی حاصل کر رہا تھا۔ اس دوران میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ ایک دن حضرت شاہ کمال کے

دستار بندی:۔ وضو فرما رہے تھے۔ یہ نزدیک ہی بیٹھے تھے۔ بہ تقاضائے صغر سنی جد بزرگوار کی دستار جوان کے نزدیک رکھی تھی۔ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی۔ اعلحضرت مسکراتے اور فرمایا کہ "برخوردار! یہ دستار تو تمہارے ہی واسطے تھی۔ لیکن تم نے جلدی کی تو اب ہم بھی جلد اس فریضہ سے سبکدوش ہوتے ہیں"۔ چنانچہ آپ نے ایک مناسب وقت پر ان کی دستار بندی کا اعلان کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اعلحضرت حوض کے کنارے وضو فرما رہے تھے۔ آپ کے دائیں طرف عصا اور عمامہ رکھا تھا۔ آپ کے پوتے کھیلتے ہوئے اس طرف آ نکلے اور آپ کا عمامہ سر پر رکھ کر اور عصا ہاتھ میں لے کر نہایت تمکنت اور سنجیدگی سے چند قدم چلے اور پھر پلٹ کر اپنے دادا سے پوچھا۔ "بابا! بتائیے میں آپ جیسا لگ رہا ہوں"؟ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور فرمایا "واقعی تم اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود مجھ جیسے لگ رہے ہو۔ اچھا اب یہ عمامہ بھی تمہارا۔ خلافت بھی تمہاری اور میری جانشینی بھی تمہاری۔" یوم مقررہ پر مشائخ عظام اور علمائے کرام کا ایک مجمع کثیر رونق افزائے کیتھل ہوا۔ جس میں اعلحضرت نے اپنے کمسن پوتے حضرت شاہ عبد اللہ سکندر کی دستار بندی فرمائی۔ ذرا چشم تصور سے دیکھیے۔ کہ حضرت شاہ کمال جیسا

صدر نشین بزم تصوف زیب مسند ہے۔ دائیں بائیں۔ آگے پیچھے وہ بزرگ تشریف فرما ہیں۔ کہ جو بحر شریعت کے غواص اور محیط طریقت کے شناور ہیں۔ ہر ایک علوم شریعت کا ماہر اور عشق حقیقی کی لذت کا شناسا ہے۔ کیتھل میں شاید اس مجمع سے زیادہ اہمیت و تقدس کا حامل مجمع چشمِ فلک نے بھی کبھی نہ دیکھا ہو۔ اور یہیں سے اس جدوجہد اور دعوت کا نقطہ آغاز شروع ہوتا ہے۔ کہ جس کے لئے حضرت اقدس نے ترک وطن کیا۔ اور کیتھل کو اپنا مستقر قرار دیا۔ اس علاقہ میں اب تک سلسلہ قادریہ سے کسی کو مطلقاً شناسائی نہ تھی۔ آپ ہی نے یہاں اس کی بنیاد رکھی۔ اور اس گلستان کی چمن بندی اس ہنرمندی اور سلیقہ سے کی۔ کہ آئندہ چل کر اس کے نتائج نہایت شاندار نکلے۔ اور اس چمن میں وہ گلہائے دل آویز و دلدار کھلے کہ جن کی مہک سے ایک عالم کا مشامِ جاں معطر ہو گیا۔ اعلحضرت کا دلِ حق آگاہ اور نگاہِ دور بین ان حالات سے بھی شناسا تھے جو اس دور میں موجود تھے۔ اور ان حالات سے بھی آگاہ تھے جو آئندہ چل کر پیش آنے والے تھے۔ یہ تمام جدوجہد اور یہ ساری تگ و دو اس سیلِ بے پناہ کے سامنے بند باندھنے کے مترادف تھی۔ بظاہر ایک سات سالہ بچہ کے سر پر قیادت و سیادت کا تاج رکھنا قیاس آرائیوں کا موضوع بن سکتا ہے۔ لیکن ظاہر بین نگاہیں ان مصلحتوں کو کیا جانیں۔ کہ جن کے تحت یہ تمام منصوبہ بندی عمل میں آ رہی تھی۔ نوجوان کاندھوں پر یہ تمام بوجھ اسی لئے رکھا جا رہا تھا۔ کہ ابتداء ہی سے انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا چلا جائے۔ اور زمانہ کی گردشیں جو رنگ بھی بدلیں اس سے انہیں آگاہی پیدا ہو جائے۔ اور یہ بحسن و خوبی اسکا مقابلہ کر سکیں۔ گذرے ہوئے وقت کی تصویر کھینچنا ممکن نہیں۔ لیکن تصور کے سہارے اس بزم جہاں زیب کی رونقِ وصف قابل دید ہے۔ کہ جس میں ایک کم سن قائد کے سر پر افسر جہاں بینی رکھا جا رہا ہے۔ اور جہاں شیخ عبد الاحد سرہندیؒ، شاہ قمیص الاعظمؒ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اور قاضی خیر الدینؒ جیسے علمائے عصر اور مشائخ وقت نہایت ادب و احترام کے ساتھ دست بہ دعا ہیں۔ اور درگاہ باری تعالیٰ میں غایت درجہ عجز و الحاح کے ساتھ عرض گذار ہیں۔ کہ بار الہا! یہ جو ایک مقدس امانت کا بار آج ایک کمسن بچہ کے ناتواں دوش

پر رکھا جا رہا ہے۔ اسے اس کے سنبھالنے کے لائق بنائیو۔ اور وہ امتحان جو اسے پیش آنے والا ہے اس میں اس کی رہنمائی کیجئیو۔

یہ ۹۶۶ھ ہے۔ نوجوان مغل فرمانروا جلال الدین اکبر کے جاہ و جلال کا آفتاب روز افزوں تابانی پر ہے۔ بوڑھے اتالیق بیرم خاں خانخاناں کی طلسماتی شخصیت کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ جہاں بانی و حکمرانی کے وہ تمام شعبے جو ابتک کسی حکمراں کے آگے سرنگوں نہ ہوتے تھے۔ اکبر کے سامنے سر بسجود ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کی وہ سرزمین جو صدیوں سے ان یلغاروں کے لئے ترس گئی تھی۔ کہ جنہوں نے اس کے سینہ کو بار بار ہلایا تھا۔ اب وہ سرزمین مغل بادشاہ کی فوجوں کی ترک تازیوں سے لرزاں و ترساں تھی۔ غیر مستحکم حکومتوں کے سبب نظم و نسق ملکی جو تباہ ہو چکا تھا۔ اب نئے سرے سے زندگی و تابانی حاصل کر رہا تھا۔ وقت کی یہ کروٹ چمنستان ہند کے لئے ایک تازہ بہار کا پیغام لائی تھی۔ لیکن اس گلستان میں خارستان کی افزائش کے سامان بھی تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں۔ بلکہ پیشبندی و دور اندیشی کا انتہائی بلند مظاہرہ ہے۔ کہ جب شہنشاہ جلال الدین اکبر کاروبار حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ عین اسی وقت کیتھل میں بزم تصوف کے تاجدار شاہ عبد اللہ سکندر روز کی مسند نشینی کا اعلان ہوتا ہے۔ تاکہ وہ گلستان جس میں کانٹوں کی افزائش کے سامان پوشیدہ تھے۔ بیرونی اور اندرونی اثرات سے پاک کیا جا سکے۔ اور ان بزرگان ملت کی یہ سعی کہاں تک کامیاب ہوئی۔ اس کا جواب اس کتاب کے آئندہ اوراق دیکھئے۔

حکومت اور اھل اللہ۔

تاریخ اسلام کا یہ باب اگرچہ نہایت اندوہناک اثرات دل پر پیدا کرتا ہے۔ لیکن اسے ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت

(یعنی خلافت راشدہ کا دور ختم ہونے کے بعد سلطنت اور حکومت پر خاندان بنو امیہ نے تسلط

حاصل کر لیا)، تو معاً دنیائے اسلام ذہنی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ گروہ تھا۔ کہ جس نے اپنا مطمح نظر ریاست و امارت رکھا تھا۔ اور ان کی تمام و کمال مساعی اسی کے حصول کے لئے وقف تھیں۔ اور ایک گروہ وہ تھا۔ کہ جس نے دین کی حفاظت و حیانت کا فریضہ اپنے سر لیا۔ بارہا ان دونوں متضاد خیالات رکھنے والے گروہوں میں تصادم ہوا۔ اور نہایت کربناک حادثات و واقعات اس تصادم کے سبب ظہور پذیر ہوتے۔ جو گروہ برسر اقتدار ہوتا تہا۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی۔ کہ ہر شخص ان کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ اور کوئی شخص بھی ایسا باقی نہ رہ جائے۔ جو ان کی ہمنوائی کا دم نہ بھرے اور ان کے تمام عزائم و مقاصد کی تکمیل میں قطع نظر اس کے کہ وہ جائز ہوں یا ناجائز ان کا ساتھ دے۔ لیکن ان خاک نشین و بے سرو ساماں بزرگوں کی سخت جانی اور حق پسندی بھی قابل داد ہے۔ کہ کوئی موقع انہوں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور جب بھی اہل سطوت نشۂ اقتدار سے بدست ہو کر بدعنوانیوں پر اتر آتے۔ انہوں نے بے خوف و خطر انہیں للکارنا شروع کر دیا۔ اقتدار کا مزاج انتہا درجہ ذکی الحس ہوتا ہے۔ تخت شاہی پر بیٹھنے والوں کو یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ کوئی بوریہ نشین فقیر ان کی مخالفت کی جرات کرے۔ اور وہ طریقہ کار اور لائحہ عمل جو یہ رائج کرنا چاہتے تھے ان میں کوئی حارج ہو۔ چنانچہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اقتدار اپنی سخت گیری اور سزا دہی کے ترکش کے تمام تیر ان پر چلا دیتا۔ تب بھی یہ سرفروش اپنی ہٹ سے باز نہ آتے تھے۔ یہاں ان تمام تاریخی واقعات کا تذکرہ مقصود نہیں جو اس ضمن میں رونما ہوتے۔ مدعا اس دور کے حالات کی نقشہ کشی ہے۔ جبکہ سرزمین ہند پر حضرت شاہ کمال قادریؒ نے قدم مبارک رکھا ان دنوں مہدوی تحریک کا غلغلہ ہندوستان میں برپا تھا۔

مهدوی تحریک:۔

اس تحریک کے کارکنوں کے عقائد سے قطع نظر قابل دید ان کا جوش اصلاح۔ اور ذوق عمل ہے۔ تخویف و تحریص کا کوئی حربہ باقی نہ رہا۔ جو ان پر نہ آزمایا گیا ہو۔ لیکن یہ سخت جاں گروہ تھا۔ کہ

پر سختی کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لے گیا۔ مگر اپنی راہ پر گامزن رہا۔ اس تحریک کے بانی سید محمود جونپوری۔ شیخ علائی اور عبد اللہ نیازی پر جو کچھ گذری۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شمع اسلام کے یہ پروانے سر بکف آگے بڑھتے رہے۔ اور جان و مال بصد مسرت اپنے مقاصد پر قربان کرتے رہے۔

تڑپ کر وہ شعلوں کے منہ پہ جا گرنا　　وہ بد نصیبوں کو دھن آشیاں بچانے کی

قابل غور نکتہ:۔ لیکن یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے

ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجا ست

جب اسلام شاہ سوری کے دربار میں شیخ علائی پیش ہوتے۔ تو وہ ان کی للہیت۔ بے نفسی۔ زہد بے ریا۔ اور عمل سے مزین علم سے بے حد متاثر ہوا۔ اور انہیں اپنی حکومت میں محتسب شریعت کا عہدہ قبول کرنے کی پیشکش کی۔ یہ پیش کش بلاشبہ نہایت قابل قدر تھی۔ اور وہ اس ذریعہ سے بوجہ احسن اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے جوش عمل کے زور میں اس پیش کش کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور بے تامل اسے ٹھکرا دیا۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا شاید ان بزرگوں کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ کہ پر جوش طبائع کسی پابندی کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اور آخر کار یہ اس انجام سے دوچار ہوتے۔ جو ان مجاہدین کے مقدر میں ازل سے تحریر ہو چکا ہے۔ انہیں شیخ الاسلام ملا عبد اللہ سلطانپوری نے کوڑوں سے پٹوا کر شہید کرا دیا۔ حاکم وقت اور موجودہ حکومت سے عدم تعاون اس قسم کے لوگوں کی ناکامی کا ایک بڑا سبب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ذرا حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے۔ تو اس جوش عمل کے نتائج نہایت شاندار نکل سکتے ہیں۔ جیسا کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے طرز عمل سے واضح ہوتا ہے۔ کہ امرائے دربار سے آپ کے تعلقات نہایت وسیع اور ہمہ گیر تھے۔ اور اسی طبقہ سے تعاون کا نتیجہ تھا کہ مجددی تحریک نے نہایت شاندار نتائج پیدا کیے۔

مہدوی عمل:- اگر مہدوی تحریک کے بانیوں کی مانند ابتداء ہی میں حکومت وقت سے ٹکرو جاتے تو شاید اس قدر کامیابی حاصل نہ کر سکتے۔ اور اگر ایسا موقع پیش بھی آیا۔ تو وہ اس ابتلاء سے بڑی حسن و خوبی کے ساتھ سرخرو نکلے۔ اوراق ماسبق کا بغور مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ مہدوی تحریک کا بنیادی پتھر کیتھل ہی میں رکھا گیا۔ اور اس خاکہ کی ابتدائی نقشہ کشی۔ یہیں ہوئی۔ چنانچہ ان حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد وہ انتہا جو حضرت مجدد صاحبؒ کی تحریک کی کامیابی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس کی ابتداء کا سراغ۔ یہیں سے ملے گا۔

حکومت سے عدم تعاون و تعاون:- حضرت شاہ کمالؒ کے متعلق پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ کوفہ سے ترک وطن کرنے کے بعد جب اول اول آپ نے بلدہ ملتان میں قیام کیا۔ تو آپ کی شہرت اطراف واکناف میں۔ بہت جلد پھیل گئی۔ چنانچہ تذکرہ حدیقۃ الخوارق کے اندراجات سے ظاہر ہے۔ کہ دربار شاہی سے حاکم ملتان کی معرفت ایک بڑی رقم آپ کے پاس بطور نیاز بھیجی گئی۔ جسے آپ نے نہایت بے اعتنائی سے واپس کر دیا۔ ایک واقعہ شاہ گجرات سے ملاقات کا بھی اسی تذکرہ میں مذکور ہے کہ فرمانروائے گجرات آپ کی کرامت سے متاثر ہو کر آپ کا والہ وشیدا بن گیا۔ علاوہ ازیں دیگر امرائے دربار کا ذکر بھی اس ضمن میں آتا ہے۔ لیکن آپ کی طبیعت پر ابتدا ہی سے آزادی و آزادہ روی کا جو رنگ غالب تھا۔ اس کے زیر اثر آپ نے شاہی طمطراق سے مطلقاً کوئی اثر نہیں لیا۔ اور اپنی بے اعتنائی کی روش کو برقرار رکھا۔ لیکن مختلف مقامات کی سیاحت کرنے اور۔ یہاں کی حالت کو بغور دیکھنے کے بعد آہستہ آہستہ آپ کے رویہ میں تبدیلی ہوتی چلی گئی کیتھل میں قیام کیے۔ ابھی آپ کو دس بارہ برس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اور اب غالباً وہ وقت قریب تھا۔ کہ جس کے لئے آپ نے یہ تمام زحمتیں برداشت کی تھیں۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ ۹۶۶ھ میں جبکہ آپ نے اپنے کم سن پوتے حضرت شاہ عبد اللہ سکندر کو وارث مسند و دستار قرار دیا۔ اسی سنہ میں جلال الدین اکبر بادشاہ کی طرف سے حضرت شاہ عبد اللہ

سکندر روس کے نام ایک فرمان صادر ہوا۔

فرمان معافی:۔ جس میں مدد معاش کے طور پر اراضی آپ کے نام کی گئی تھی۔ گویا آپ خود تو بدستور اپنی اس روش پر گامزن رہے۔ جو دربار شاہی اور امرائے دربار سے بے تعلقی کے متعلق آپ نے اختیار کر رکھی تھی۔ لیکن آنے والے قائدین کے لئے یہ راستہ کچھ آسان کر دیا۔ کہ حکمران طبقہ سے اس صورت میں تعاون کا کوئی مضائقہ نہیں جبکہ مقصود اصلاح احوال ہو۔ مذکورہ فرمان شاہی کی ایک عکسی نقل بھی یہاں دی جا رہی ہے۔ ناظرین کے لئے نہ صرف اس کا مضمون بلکہ طرز تحریر بھی قابل غور ہے۔ یہ حالات جن کا اندراج یہاں کیا جا رہا ہے۔ گو قاعدہ کے مطابق سوانح حضرت شاہ عبد اللہ سکندر روس کے ضمن میں بیان کیے جانے لازم تھے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کا زمانہ کچھ اس طرح خلط ملط ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا جانا قطعی ناممکن نظر آتا ہے۔ حضرت شاہ کمال نے اگرچہ کمسنی ہی میں ان کی دستار بندی اور سجادگی کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ آپ اس کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک زندہ رہے۔ اس لئے اس دور پر آپ کے حالات کا پرتو پڑنا ناگزیر تھا۔ گو رسماً حضرت شاہ سکندر روس سجادہ نشین تھے۔ لیکن عملاً تمام معاملات پر اعلحضرت ہی کا اثر و نفوذ تھا۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ کہ نئے قائدین کے سن و سال کی کمی کا ازالہ ہو تا رہے۔ گویا کہ چاند اور ستارے سورج کی رہنمائی میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

ہالہ نور:۔ شیخ عبد الاحدؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ کمال صاحبؒ سرہند میں قیام فرما تھے۔ میں بھی حاضر خدمت تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے چہرہ اقدس سے نور اور روشنی کا ایسا انعکاس ہوا کہ سورج کی آب و تاب اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ لاریب جن کا عمل کسی عاشق کامل کے اس شعر پر ہو۔

نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

تو کیوں نہ ان پر دن رات تجلیات کا انعکاس ہو۔

ایک مرتبہ گجرات میں سلطان محمود نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کی رہائش کے لئے ایک محل تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ یہ محل کتنے عرصے میں مکمل ہو گا؟ بادشاہ نے کہا کہ اس کی تعمیر میں دو سال لگ جائیں گے۔ آپ نے فرمایا جتنی رقم اس محل پر خرچ ہو گی۔ وہ ہمارے پاس جمع کرا دو۔ بادشاہ نے وہ روپیہ آپ کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے اسی وقت وہ تمام روپیہ محتاجوں اور ضرور تمندوں میں تقسیم کر دیا۔ اور آپ نے بادشاہ سے کہا تم دو سال میں محل تعمیر کروا رہے تھے۔ یہاں پل بھر میں کئی محل تعمیر ہو گئے۔

سامانے میں ابوالفتح نامی ایک شخص ہر روز حضرت غوث الاعظمؒ کے اسم مبارک یا شیخ عبد القادر جیلانی شئ للہ کا وظیفہ کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک جن انہیں اٹھا کر آسمان کی بلندی پر لے گیا۔ انہوں نے حضرت غوث الاعظمؒ کو یاد کیا۔ یکایک ابوالفتح نے دیکھا کہ ایک بزرگ نے انہیں اس طاقتور جن سے چھڑایا۔ ابوالفتح نے اس بزرگ کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ جب سے انہیں اس بزرگ کی زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔ مگر انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ انہیں اس مصیبت سے رہائی دلانے والا کون بزرگ تھا۔ ایک روز سامانے میں کچھ لوگوں نے حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ کا ذکر کیا۔ اور ان

حاشیہ نمبر ۱۔ آپ اعلیحضرت کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ اصل نام محمود خان مگر مرشد آپ کو شیخ مودود کے نام سے پکارتے تھے لقب ابوالفتح ایرانی نسل تھے۔ ان کا شجرہ نسب نوشیرواں عادل سے ملتا ہے۔ ان کی اولاد میں حسام الدین خان، غلام محمد خان، جلال الدین خان، غلام محی الدین خان، بشیر الدین خان، یار محمد خان، عطر خان، محمدی خان اور انگریزی عہد میں نواب احمد علی خان اور نواب رستم علی خان قابل ذکر ہیں۔ اسی خاندان کے ایک نامور فرزند قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ہوئے ہیں۔ ابوالفتح سامانوی ایک درویش صفت انسان تھے۔ انہیں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی سے خصوصی عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ اعلیحضرت نے خوش ہو کر فرمایا! ابوالفتح تمہاری جبین میں وہ چمک ہے کہ دنیا تمہارے دروازے پر دستک دے گی اور تمہارا یہ بچہ ازل سے ہماری دعا کے سایہ میں ہے۔ ۹۹۹ھ انتقال کیا۔ مزار سامانہ ضلع پٹیالہ میں ہے۔ اعلیحضرت کے خاندان کو یہ منزل خاندان ہمیشہ اپنا مرشد اور رہنما تسلیم کرتا رہا

کے تصرفات اور خوارق کا ذکر سن کر آپ کی زیارت کا شوق دامنگیر ہوا۔ ایک روز یہ اپنے احباب کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے پہلی نظر میں آپ کو پہچان لیا۔ کہ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اس روز جنات سے رہائی دلائی تھی۔ بے ساختہ اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا ابوالفتح ساماتوی ایک مرتبہ اپنے گھر (سامانہ) میں کھانا کھانے لگے۔ پہلے لقمے پر انہوں نے خیال کیا کہ کاش یہ لقمہ میرے پیر نے کھایا ہوتا۔ دوسرے اور تیسرے لقمے پر بھی یہی خیال کیا۔ چوتھے لقمے پر بھی یہی خیال دل میں آیا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا! کہ ابوالفتح مجھے تمہارے پہلے تین لقمے ہی کافی ہیں، چوتھے کی ضرورت نہیں۔

آپ بادشاہوں کی صحبت اور ان سے میل جول نہیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ شیر شاہ سوری نے آپ کی خدمت میں اپنے وزیر فرعلی کو نقدی اور مواضعات
کا پٹہ دے کر ملتان بھیجا۔ اور بادشاہ کی طرف سے درخواست کی کہ میرے غریب خانے پر دہلی تشریف لا کر قدم بوسی کا شرف بخشیں۔ اگر مجھے آپکے متعلق پہلے علم ہو جاتا تو اسی وقت حاضر خدمت ہوتا۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ کیا؟ وزیر نے جواب دیا۔ کہ یہ نقدی اور دیہات کا پٹہ ہے آپ نے فرمایا۔ نقدی درویشوں میں تقسیم کر دو۔ اور خود کچھ نہ لیا۔ اگرچہ گھر میں کئی روز سے فاقہ تھا۔ اور زمین کا پٹہ واپس کر دیا۔ اور لکھا میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ عادل بادشاہ کو اپنی رعایا کی خبر گیری رکھنی چاہیئے۔ اور اپنی تمام توجہ اپنی سلطنت کو آباد کرنے میں صرف کرنی چاہیئے۔ بندہ جب خدا کا ہو جاتا ہے تو جہل کی جگہ علم۔ اور بعد کی جگہ قرب اور سکوت کی جگہ ذکر اور تاریکی کی جگہ روشنی عطا فرماتا ہے۔ تمہیں مخلوق خدا کی پاسبانی کے لئے چنا گیا ہے۔ تمہارے عدل کی بدولت فقیر بھی دلجمعی کے ساتھ اپنی عبادت میں مشغول ہے۔ آپ نے لکھا کہ ہم جہاں بھی ہیں آپ کے حق میں دعا گو ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں گذشتہ دنوں دہلی کی جامع مسجد میں اس فقیر سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔ کیا وہ کافی نہیں؟

ایک مرتبہ آپ شیر پر سوار بابا سیتل پوری سے ملنے گئے۔ سیتل پوری اس وقت دیوار پر بیٹھے

ہوئے تھے ۔ جب آپ کو اس حالت میں آتے ہوئے دیکھا تو پیشوائی کو آگے بڑھے ۔ سیتل پوری نے عرض کی شیر کو کہاں باندھا جائے ۔ آپ نے فرمایا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اسے اپنی گایوں میں چھوڑ دو ۔ شیر نے گایوں میں رہ کر انہیں ہلاک کرنے کی کوئی کاروائی نہیں کی ۔ اس پر بابا سیتل پوری حیران رہ گئے ۔

شیخ عبدالاحد ایک مرتبہ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ۔ ہر چند علاج معالجہ کیا ۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا ۔ آخر انہوں نے آپ کی خدمت میں اطلاع بھیجی ۔ اس اطلاع کے چند روز بعد آپ نے وضو کیا ۔ جب آپ سر کا مسح کر رہے تھے ۔ تو بلند قامت افراد وارد ہوتے خادم نے دریافت کیا ۔ تم کون ہو ؟ انہوں نے جواب دیا ۔ خدا کے بندے ہیں ۔ آپ دائیں پاؤں کو دھو رہے تھے کہ دو اور شخص اسی صورت اور لباس کے ظاہر ہوتے ۔ خادم کے استفسار پر انہوں نے جواباً کہا کہ "ہمیں آپ نے شیخ عبدالاحد کے لئے طلب کیا ہے" ۔ آپ نے وضو کے بعد ان چاروں سے دریافت کیا کہ آپ میں سے کون شیخ عبدالاحد سے متعلق ہے ؟ انہوں نے دست بستہ جوابدیا کہ ہم اسی افراد روئے عالم پر زحمت کے نام سے مقرر ہیں ۔ اور حکم الہی سے مزاج کے اختلاف کے مطابق لوگوں کے احوال پر مسلط ہیں ۔ اور شیخ عبدالاحد پر مسلط یہ شخص ہے ۔ اس نے اقرار کیا کہ اللہ کے حکم سے میں شیخ عبدالاحد کے احوال پر مسلط ہوں ۔ آپ نے فرمایا ! شیخ عبدالاحد سے درگذر کرو ۔ اس نے جواب دیا "یہ اللہ کے حکم سے ہے" آپ نے فرمایا ۔ "شیخ عبدالاحد ہمارا طالب خاص ہے ۔ اور ہمیں اللہ کی طلب خاص ہے ۔ اس لئے اسے چھوڑ دو" اس نے اقرار کیا اور ایک ماہ کی مہلت طلب کی ۔ اور آپ سے اجازت لے کر غائب ہو گیا ۔ حضرت شیخ ایک ماہ تک مرض میں مبتلا رہے ۔ اور ایک ماہ گزرنے کے بعد صبح سویرے خود ہی بستر سے اٹھ کھڑے ہوتے ۔ اور ان کے جسم پر مرض کا کوئی اثر باقی نہ رہا ۔ صبح کو احباب آتے اور آپ کو صحتمند دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ ان کے دریافت پر انہوں نے بتلایا یہ سب کچھ مرشد کامل کی دعا کا اثر ہے ۔

آپ کا لباس عموماً سرخ رنگ کا ہوتا تھا ۔ یا فوجی طرز کا ۔ سرخ رنگ کو دیکھ کر بہت ہے

لوگ معترض تھے ۔ خصوصاً قاضیوں کی ایک جماعت پیش پیش تھی ۔ وہ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس سلسلہ میں کچھ کہنا چاہتے تو زبان ان کا ساتھ نہ دیتی اس پر وہ شرمندہ ہو جاتے ۔ آخر ایک روز انہوں نے سفید رنگ کا لباس تیار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا ۔ آپ نے وہ لباس قبول فرما کر زیب تن کیا تو اس کی سفیدی سرخی میں بدل گئی ۔ آپ نے فرمایا ! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں کپڑے رنگوا کر پہنتا ہوں ۔ تم نے دیکھ لیا ۔ ایسا نہیں ہے ۔ قدرت خود بخود اس کو رنگ دیتی ہے ۔ میں اپنی مرضی سے نہیں پہنتا" پھر فرمایا ! سالک مثل میّت کے ہے ۔ غسال کی مرضی ہے کہ وہ اسے ٹھنڈے پانی سے غسل دے یا گرم پانی سے ۔ میت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ غسال کے سامنے لب کشائی کرے ۔ اس بنا پر آپ کا لقب لال دیال اور لال کمال پڑ گیا ۔ آپ کو لعل دیال اس لئے کہتے ہیں کہ آپ میں حد درجہ سخاوت تھی خود فاقہ سے ہوتے ہوئے کسی سائل کا سوال رد نہ کرتے ۔

رویائے صادقہ اور اس کی تعبیر :- روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیخ عبدالاحد سرہندی نے ایک خواب دیکھا کہ

" تمام جہان میں ظلمت پھیلی ہوئی ہے ۔ سور بندر اور ریچھ لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں ۔ یکایک میرے سینے سے ایک نور نکلا اور اس میں سے ایک تخت ظاہر ہوا ۔ اس تخت پر ایک شخص تکیہ لگائے بیٹھا ہے ۔ اس کے سامنے تمام ظالموں ۔ زندیقوں اور ملحدوں کو ذبح کیا جا رہا ہے ۔ اور کوئی شخص بلند آواز سے کہہ رہا ہے جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا"

شیخ عبدالاحد نے یہ خواب اپنے مرشد والاعتبار حضرت شاہ کمال قادریؒ سے بیان کیا ۔ جو کہ ان دنوں سرہند میں قیام پذیر تھے ۔ اعلٰحضرت نے یہ خواب سن کر فرمایا ! "کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک فرزند عطا کریں گے جس کی بدولت دنیا سے شرک وبدعت کی ظلمت دور ہو گی ۔ اور زندقہ والحاد معدوم ہو جائیں گے ۔"

شیخ عبدالاحد کے تین فرزند موجود تھے۔ یہ رویائے صادقہ دیکھنے کے بعد جب قطب دوراں اور سرتاج اولیائے زماں کی زبان سے اس کی تعبیر سنی۔ تو وہ فخر و مسرت کے جذبات سے جھوم اٹھے اولاد بذات خود ایک موہبت الٰہی اور نعمت عظمیٰ ہے۔ لیکن ایسی اولاد جو دین و دنیا کی مجلسوں کو اپنے علم و عمل کی روشنی سے منور کر دے۔ اس پر کون ہے جو فخر نہیں کرے گا۔ اس خواب کے بعد جب بھی اعلٰحضرت سے ان کی ملاقات ہوتی۔ آپ انہیں ایسے فرزند کی ولادت کی خوشخبری دیتے جو اس عالم خاندان میں مہر و ماہ بن کر چمکنے والا تھا۔ یوں کہیے کہ جس طرح تغیر عالم کی رازداں نگاہیں لیل و نہار کی تبدیلیوں پر نظر رکھتی ہیں۔ اور وقت سے بہت پہلے طلوع آفتاب کی خبر دے سکتی ہیں۔ اسی طرح حضرت کبیر ملک العشاق کے ضمیر منور پر بھی آنے والے واقعات انعکاس پذیر ہو رہے تھے۔ صدیوں سے خشک زمین جس بار کرم کی منتظر تھی۔ اسے برسانے والے بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ اور آپ کی حیات لطیف نے پہلے ہی سے اس کا ادراک کر لیا تھا۔ اسے ہی کشف و کرامات کا نام دیا جاتا ہے۔ اور یہی روشن بصری کہلاتی ہے چنانچہ حضرت عبدالاحدؒ جو اپنے ہادی روشن ضمیر کے ہر سخن کو حسن الہام سے آراستہ دیکھتے تھے جب آپ کی زبان سے ایک عالی شان فرزند کی آمد کی خوشخبری سنتے۔ تو ان کا سینہ فخر و مسرت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ خود اس خبر سے لطف اندوز ہوتے۔ بلکہ تمام متعلقین کو بھی اس خوان مسرت میں شامل کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ تمام خاندان اس صبح دل آویز کا منتظر تھا۔ جو شیخ احمد سرہندی کے نام سے زمانہ میں مشہور ہوا۔ اور جس نے بلاشبہ ہندوستان میں زمانہ کا رخ بدل دیا۔ اور دین کی رفتار کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔

امام ربانیؒ کی ولادت:- آخر وہ صبح سعادت بھی گردش لیل و نہار کے حجابات میں سے نمودار ہو ہی گئی۔ کہ جس کا انتظار ہر ذرہ کائنات کو تھا۔ یعنی عبدالاحد سرہندی کے مشکوئے معلے میں بتاریخ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ شیخ احمد سرہندی کی ولادت ہوئی۔

امام ربانی کی علالت :- زبدۃ المقامات کی روایت ہے کہ عہد طفلی میں ایک مرتبہ ان پر ضعف اور بیماری کا غلبہ ہوا۔ اور یہ سلسلہ تشویشناک حد تک دراز ہو گیا۔ ان کی والدہ محترمہ اس کیفیت سے سخت پریشان ہوئیں۔ انجاح مرادات کا ایک ہی وسیلہ ان کی والدہ محترمہ اور شیخ عبد الاحد کے سامنے تھا۔ اور ایک ہی آستاں تھا کہ جس پر جبیں سائی تسکین دروں کا سامان رکھتی تھی چنانچہ ماں اور باپ دونوں اس گوہر گراں مایہ اور متاع بے بہا کو دامن شفقت میں چھپاتے عازم کیتھل ہوئے۔ اور انہیں حضرت اقدس کے قدموں میں لا ڈالا۔ آپ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا کہ انشاءاللہ اسے عمر دراز حاصل ہو گی۔ اور یہ وہی بطل عظیم ہے۔ کہ ساری دنیا جس کی منتظر تھی۔ اس کی فیض رسانیوں سے ایک عالم سیراب ہو گا۔ اعلیحضرت کی زبان فیض ترجمان سے یہ کلمات ادا ہو رہے تھے اور فکر مند والدین کے دل شگفتہ ہوتے جا رہے تھے۔ تا آنکہ آہستہ آہستہ ان کی ضعف وبیماری کے آثار محو ہونا شروع ہوتے۔ اور صحت و توانائی جسم پر غالب آنے لگی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ مقدس قافلہ کیتھل سے بصد لطف ومسرت اپنے دامن مرادیں گلہائے مسرت لیے وطن مالوف کی طرف شاداں وفرحاں واپس لوٹا۔

شیخ عبد الاحد کے دل حق آگاہ پر یہ امر بخوبی روشن تھا۔ کہ میرا یہ فرزند دلبند کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ جس کی ولادت کی بشارت حضرت شاہ کمال قادری جیسے قطب دوراں وقطب ارشاد نے دی۔ اور جس پر ان کی نگاہ شفقت کمال درجہ کی ہے۔ چنانچہ شیخ عبد الاحد کی یہ خواہش بالکل قدرتی تھی۔ کہ ان کے اس بچہ پر مخدوم روزگار حضرت شاہ کمال کی نگاہ کیمیا اثر زیادہ سے زیادہ پڑتی رہے۔ سورج کی روشنی جس طرح کثافت کو دور کرنے اور ظلمتوں کو کافور کرنے والی ہوتی ہے۔ عین اسی طرح وہ نظریں جو حسن ازل کے انوار سے منور ہوتی ہیں۔ دلوں کے زنگ دور کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ بار بار معہ اہل وعیال کیتھل کا سفر کیا تے تھے۔ اور اس بچہ کو ہمراہ لایا کرتے تھے۔ جو آئندہ چل کر دانایان روزگار کا سرتاج بننے والا تھا۔ ادھر حضرت

کبیر ملک العشاق بھی ان پر اعلیٰ درجہ کی عنایت فرمایا کرتے تھے۔ اور ان کی ذات میں ان انوار کو ملاحظہ فرماتے تھے۔ جو آئندہ چل کر زندقہ والحاد کے اندھیرے کو دور کرنے والے تھے۔ چنانچہ جب بھی آپ سرہندیا پائل میں وارد ہوتے تو انہیں ضرور طلب فرماتے تھے۔

حضرت شاہ کمال رح کی مجلس میں حاضری:۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی عمر اعلیحضرت کی رحلت کے وقت گیارہ سال کی تھی۔ اور یہ کئی مرتبہ اپنے والد محترم کی ہمراہی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ مجھے وہ حجرہ اچھی طرح یاد ہے۔ کہ جہاں حضرت شاہ کمال قادری بیٹھا کرتے تھے۔ اور ان کا حلیہ بھی پوری طرح ان کے ذہن میں محفوظ و موجود تھا وہ باتیں اور گفتگوئیں جو اس مقدس مجلس میں ہوئی تھیں۔ بہت حد تک وہ بھی انہیں یاد رہیں۔ جس کا تذکرہ والہانہ انداز میں آپ اکثر کیا کرتے تھے۔[1]

ان واقعات پر چار سو سالوں کا گرد و غبار پڑا ہوا ہے۔ ہمارے تخیل کی پرواز چاہے کتنی ہی دور رس ہو۔ اور ہمارے تصور کی بلند پروازی چاہے کتنی ہی بلند ہو۔ مگر یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ کہ ہم اس دور کی صحیح نقشہ کشی پر قادر ہو سکیں اور ماضی کے تہ بہ تہ پردوں کو ہٹا کر اس محفل گرامی کی جھلک دیکھ سکیں۔ کہ جہاں اعلیحضرت جیسا مخدوم روزگار صدر نشین ہے۔ آپ کے سامنے وہ مقدس ہستیاں دو زانو با ادب متمکن ہیں کہ جن کا نام کتاب زندگی میں سنہری حروف سے لکھا ہوا ہے۔ یہ شیخ عبدالاحد بیٹھے ہیں۔ ان کے برابر ہی امام ربانی طفولیت کی معصومیت میں بزرگی کے آثار لیے مرشد والا تبار کے ارشادات کو دل میں جگہ دے رہے ہیں کبھی حضرت شاہ قمیص الاعظم اس دریائے فیض سے اپنی سرشاری و سیرابی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اسی بزم قدس میں وہ کمسن قائد بھی جلوہ آرا ہے کہ جو آئندہ چل کر اعلیحضرت کے عزائم کو پورا کرنے والا ہوگا۔ حضرت شاہ عبداللہ سکندر طفولیت کی وادیوں سے نکل کر عہد شباب کی سرزمین

1۔ زبدۃ المقامات

میں قدم رکھ چکے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان مجالس میں کیسے کیسے معاملات زیر بحث آتے ہوں گے۔ اور کیا کیا تجاویز پیش نظر منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے پیش ہوتی ہوں گی۔ حضرت شاہ سکندر قادری اور حضرت مجدد الف ثانی نے آئندہ زمانہ میں جو کارنامے سرانجام دیے۔ اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے جو تدابیر اختیار کیں۔ مکمل یقین اور کامل وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی بنیاد انہیں مجالس میں پڑی۔ ان دنوں جو حالات موجود تھے۔ وہ بھی کچھ ایسے زیادہ قابل اطمینان نہ تھے۔ اور جو واقعات پیش آنے والے تھے۔ انکی سنگینی کا پرتو ابھی سے وقت کے چہرہ پر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ تو کیا اس کے سدِباب کی طرف سے یہاں غفلت برتنا ممکن تھی؟

زمانہ کے اطوار کو بدلنا کچھ سہل کام نہیں۔ اس کے لئے عظیم منصوبہ بندی کی ضرورت اور غایت درجہ دانشورانہ حکمت عملی کی حاجت ہوتی ہے۔ جوش عمل کا دامن جب تک صبرو استقلال کے ستاروں سے مزین نہ ہو۔ تب تک کامیابی ممکن نہیں۔ مجاہدانہ صلاحیتیں اسی وقت مفید نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔ جب اس کی راہنمائی گہری بصیرت اور عمیق نظری کر رہی ہو۔ اعلحضرت کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ آپ نے نہایت قلیل عرصہ میں ایسے بالغ نظر افراد کی تربیت کی اور انہیں اپنی نگاہ کرم سے اس طرح نوازا۔ کہ وہ ہر طرح زمانہ کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کے قابل ہو گئے۔ آپ کی تعلیمات کا جو خلاصہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ اس پر ایک غائرانہ نظر ڈالیے اور اندازہ کیجیے کہ اس انداز تعلیم اور طریق تبلیغ نے زمانے کے بگڑے ہوئے مزاج کو کس کس طرح جھنجھوڑا ہو گا۔ اور آپ کی مجالس میں اس مخصوص انداز فکر کے اظہار نے جو صرف آپ ہی کا حصہ تھا۔ نوجوان سینوں میں کیسے کیسے طوفان برپا کیے ہوں گے۔ کاروان حریت کے سالاروں کو اسی بزرگ کی محفلوں میں اپنی منزل کا سراغ نظر آیا۔ اور یہیں وہ شاہراہ تیار ہوئی۔ کہ جس پر چلنے والوں نے دنیا کو انقلاب کے حقیقی مفہوم سے آشنا کیا۔

اکبر کی تمنا۔ لادینی ریاست:- گذشتہ اوراق میں ضمناً اکبر بادشاہ کے ذہنی انقلاب

کے متعلق چند ایک اشارات کیے گئے ہیں نامناسب نہ ہوگا۔ اگر اس اجمال کی ایک مختصر سی تشریح اپنے مقاصد کو زیادہ واضح کرنے کے لئے یہاں کر دی جائے۔

یہ امی محض بادشاہ اولوالعزم ہونے کے ساتھ نہایت زیرک وہوشمند بھی تھا۔ علماء کی صحبت اور تاریخی واقعات سے واقفیت کے سبب اسے حکومتوں کے عزل ونصب اور خاندانوں کے عروج وزوال کے اسباب سے مکمل آگاہی تھی۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے جتنے خاندان گزرے تھے۔ ان میں کسی کو بھی پچاس سال سے زائد حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔ بلکہ بعض خاندانوں کا انجام تو اسنا عبرتناک ہوا۔ کہ شاید ان کے شدید مخالفوں کی آنکھیں بھی اس انجام کو دیکھ کر آنسو بہائے بغیر نہ رہی ہوں۔ اکبر نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بعد اس کے وارث مخالفوں کی تیغ ستم کا شکار اور اس کے اخلاف تخت شاہی سے اتر کر تختہ دار سے ہمکنار ہوں۔ لیکن یہاں جو انداز حکومت اور طریق حکمرانی تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اکبر کا یہ خواب ہرگز ہرگز شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا تھا۔ ملکی رعایا کی غالب اکثریت ہندو تھی۔ اور حاکم ان پر مسلمان تھے۔ جن میں سے بیشتر غیر ملکی تھے۔ رعایا کو کسی بھی حکمران خاندان سے مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چونکہ کسی حکمران خاندان کا زوال یا عروج ان کی زندگی میں مطلقاً کسی قسم کی روکاوٹ نہ ڈال سکتا تھا۔ اور نہ بادشاہ کی موت یا حکومت سے برطرفی کسی انقلاب کا سبب بنتی تھی۔ سو ایک ایسی حکومت کا قیام جس کی بنیاد مستحکم ہو اور جسے انقلاب کی کوئی جنبش اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اگر اکبر کی تمنا تھی۔ تو کوئی تعجب نہیں۔ لیکن یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے خود بادشاہ کو ایک انقلابی منزل سے گذرنا ضرور تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی حکمران طبقہ اور رعایا کے ذہنوں کی تبدیلی لازمی تھی۔ اکبر کا یہ خواب اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا۔ کہ ہندوستان میں ایک "لادینی ریاست" کا قیام عمل میں لایا جائے۔ لیکن ایک لادینی ریاست کا قیام کوئی آسان کام نہ تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس قسم کی کوئی کوشش ایرانی وتورانی امراء کی ناراضگی کا باعث ہوتی۔ بلکہ طبقہ علماء کہ جس کا اثر حکومت کے ہر شعبہ پر نمایاں تھا۔ بادشاہ کا ہمنوا نہ ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں اکبر نے اپنی ابتدائی زندگی جس طرح کے

مذہبی اور اسلامی ماحول میں گزاری تھی۔ اس کا بھی تقاضا تھا کہ وہ علمائے کرام سے کسی ایک مسئلہ پر بھی اختلاف کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ اورنگ سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد بھی اس کا یہ عالم تھا کہ صحن مسجد میں جھاڑو دیتا۔ نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرتا۔ اور مقتدر علماء و صلحاء کے سامنے باادب دوزانو بیٹھتا۔ اس ذہنیت کے انسان سے کیسے ممکن تھا کہ وہ علماء کے قبضہ اقتدار سے باہر نکل سکتا۔ بلکہ جوں جوں اس کی عمر زیادہ ہوتی گئی۔ ایک مستحکم و پائیدار حکومت کے قیام کی تمنا اس کے دل میں زیادہ سے زیادہ چٹکیاں لینے لگی۔ مگر یہ جو مذہب کا سنگ گراں اور علمائے کرام کا وجود اس کی راہ میں حائل تھا۔ اس کا کوئی علاج اس کے پاس نہ تھا ایرانی و ترکی امراء تو اس کی شجاعت و شہامت اور تدبر و معاملہ فہمی کے سامنے ذہنی اعتبار سے مفلوج ہو چکے تھے۔ لیکن طبقہ زہاد کے اس حصن حصین کو سر کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا جو بات اس کے دل میں پختہ ہو چکی تھی۔ وہ کیسے نکلتی۔ معاملات شریعت کے متعلق اس کا نقطہ نگاہ یہ تھا۔ کہ انہیں سوا طبقہ علماء کے اور کوئی طے کر ہی نہیں سکتا۔ اور اس طبقہ کی مخالفت گویا خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے مترادف ہے۔ لیکن قدرت نے جو کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے اسباب خود بخود مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ فرمان قضا تھا۔ کہ نسل چنگیزی یہاں تین سو سال تک حکمراں رہے۔ اور اس کی حکومت میں کوئی غیر شریک و سہیم نہ ہو

علماء کا وہ طبقہ جس کے تقدس، علمیت و عظمت کے سامنے اکبر کا سر ہر دم سرنگوں رہتا تھا۔ اچانک اس کے اسرار اس پر آشکار ہونا شروع ہوئے۔ ہمایوں کی ابتدائی عہد میں دو بزرگ ہندوستان کے دینی اور مذہبی افق پر جلوہ طراز ہو چکے تھے۔ ایک مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور دوسرے شیخ عبدالنبی گنگوہی۔ ہمایوں کی جلاوطنی کے بعد شاہان سور کے دور حکومت میں ان کا اقتدار زیادہ سے زیادہ بڑھتا چلا گیا۔ اور جب اکبر نے ۹۶۳ھ میں تخت سلطنت پر جلوہ فرمایا۔ تو ان دونوں بزرگوں کی علمیت اور دینی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جوں جوں ان کا اقتدار بڑھتا چلا گیا اسی مناسبت سے ان کے نشہ غرور و پندار بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا گیا۔ اور

اس نشہ اقتدار کی سرشاری میں انحضرات سے ایسی ایسی لغزشیں سرزد ہوئیں کہ شاید ان کے کوئی بڑے سے بڑا حامی ان کوتاہیوں کی کوئی تاویل نہ کر سکا۔ منجملہ دیگر عیوب کے اس نشہ اقتدار کی ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ کسی مد مقابل کو برداشت نہیں کر سکتا ان دونوں بزرگوں نے اپنے دوسرے ہمعصروں کو تو پست و ذلیل کر ہی رکھا تھا۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ یہ آپس میں الجھ پڑے اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی ہوا اکھڑ گئی اور اس طبقہ کا جو رعب و دبدبہ بادشاہ کے دل پر بیٹھا ہوا تھا اس کے اثرات یکسر محو ہونا شروع ہو۔ گئے ان بزرگوں کے نہاں سے آگاہی پا کر جو ضعف اسکے معتقدات کو پہنچا اسکی تلافی کیلئے اس نے عبادت خانہ کے نام سے اہل علم کی ایک مجلس قائم کی تاکہ وہ اپنے دینی تصورات کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے سکے لیکن عبادت خانہ کی مذہبی مجلس میں علماء نے جو کردار ادا کیا وہ بجائے خود ایسا شرمناک تھا کہ بادشاہ جس نے اپنے اعتقادات کو سہارا دینے کے لئے یہ اہتمام کیا تھا ان دعویداران مذہب سے اور بد ظن ہو گیا اور اس بنا دیگر مذاہب میں حق کی جستجو اور سکون کی تلاش شروع کر دی اور اب تک جو معاملات وہ صرف مسلمان علماء تک محدود رکھتا تھا اسے انہیں وسعت دیکر تمام ہندوستان کے مذہبی راہنماؤں تک پہنچا دیا اور یہیں سے گویا اس کی لادینی ریاست کی بنیاد مستحکم ہونا شروع ہوئی مذہبی تعصب سے بالاتر ہونے کے بعد بھی اکبر کی ذہنی کشمکش تمام نہیں ہوئی تھی۔ شرعی معاملات کے فیصلوں میں اب تک وہ علماء کا محتاج تھا۔ لیکن اس کی یہ ذہنی کشمکش بھی بہت جلد ایک حلقہ تثلیث نے ختم کر دی۔ یہ حلقہ تثلیث مشتمل تھا ایک باپ اور دو بیٹوں پر۔ ناگور کے شیخ مبارک جو ایک بلند پایہ عالم تھے۔ علم کے ساتھ آزادی خیالات کے جوہر سے بھی آراستہ تھے۔ اس لئے مجموعہ اضداد تھے۔

اس قسم کے آزاد خیال لوگ تنگ نظر اجارہ داران مذہب کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کھٹکتے آئے ہیں۔ چنانچہ انہیں بھی طبقہ علماء کے ہاتھوں بہت زخم کھانے پڑے۔ ملا عبد اللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کا دُرۂ احتساب تو خصوصاً ان کی کمر پر ہمیشہ برستا رہا۔ لیکن جب ان دونوں کا زور ٹوٹا۔ تو یہ شیخ مبارک اپنے دونوں بیٹوں شیخ فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ بادشاہ کے دربار میں بار

یاب ہوئے۔ چونکہ دربار کا رنگ بدل چکا تھا۔ وہ علماء جنہیں ننگ نظر سمجھا جاتا تھا۔ ان کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ شیخ مبارک اور ان کے دونوں بیٹوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ قابلیت تینوں کی مسلم تھی۔ اور اس پر درباداری کا سلیقہ مستزاد۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں ان کا رنگ جم گیا۔ بادشاہ کو جو بھی الجھن پیش آتی۔ یہ اسے چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔ یہی مسئلہ بادشاہ کے لئے لاینحل بنا ہوا تھا کہ کسی ایک معاملہ میں ملکی مصالح کا تقاضا کچھ اور ہوتا تھا لیکن مفتیان کرام کچھ اور کہتے تھے۔ لیکن بعض اوقات تو کاروبار سیاست میں علماء کے مشورہ پر عمل کرنے سے خود استحکام سلطنت میں ضمحال پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ بادشاہ کو اس دلدل سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن بھلا ہو شیخ مبارک اور اس کے فرزندان دلبند کا کہ انہوں نے بادشاہ کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اکبر کا مزاج تو بدل ہی چکا تھا۔ اسے یہ سمجھنا کچھ ایسا زیادہ مشکل نہ رہا۔ کہ کسی ایسے معاملے میں جہاں ملکی مصالح اور شریعت میں تصادم یا تناقض نظر آتے۔ بادشاہ عادل خود فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔ اور درجہ۔ اجتہاد رکھتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک محضر نامہ تیار کیا گیا۔ جس میں مفصل طور سے بادشاہ عادل کے اس حق کا ذکر کیا گیا۔ اور تمام علماء کے اس پر دستخط کرائے گئے۔ طوعاً یا کرہاً دستخط سب نے کر دیے۔ لیکن مقام عبرت ہے کہ اس محضر نامہ پر مخدوم الملک شیخ عبدالنبی، قاضی جلال الدین۔ قاضی خان بدخشی، میراں صدر جہاں نے بھی دستخط کر دیئے۔

کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

زمانہ بدل چکا تھا۔ اگر ان بزرگوں کی جگہ امام احمد بن حنبلؒ یا امام ابن تیمیہ ہوتے۔ تو اس قسم کے محضر نامہ پر کوئی ان سے دستخط کرا سکتا تھا؟ مولانا آزاد مرحوم کی یہ رائے اگر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں "اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفہ وقت و ارباب حل و عقد و اصحب شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے۔ اور اس کے سدباب نے اسلام۔ کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی" لیکن جو حالات یہاں تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ا...

محضر نامہ نے اکبر بادشاہ کو ایسے ہتھیار سے مسلح کر دیا۔ جس کی کاٹ کا کوئی علاج نہ تھا۔ علماء سو کی احمقانہ روش نے اسے طبقاتِ علماء کو ایک طرف خود مذہب اسلام ہی کی طرف سے مشکوک کر دیا تھا۔ اور اس کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی۔ کہ سچائی اور برگزیدگی صرف اسلام ہی کا حصہ نہیں۔ بلکہ ہر مذہب میں اس کا وجود موجود ہے۔ اور ہر مذہب سے بقدر استطاعت استفادہ کرنا چاہیئے۔ اب جبکہ اسے قانون سازی اور معاملات شریعت تک کو نافذ کرنے کے اختیار مل گئے۔ اگر اس کی بے راہ روی تمام حدود پھاند گئی تو کیا تعجب ہے۔ اب اسے بے غل وغش اپنے منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے ساز گار ماحول میسر آ گیا۔ اور وہ لادینی ریاست جو اس کا مطمحِ نظر اور منتہائے مقصود تھا۔ اس کے قیام کے لئے راستہ آسان ہو گیا۔ یہ محضر نامہ ۹۸۷ھ میں تیار ہوا۔ گویا دربار اکبری میں جس لادینیت کی تخم ریزی سن نو سو بیاسی (۹۸۲ھ) سے ہونی شروع ہوئی تھی۔ اس نے ۹۸۷ھ میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان میں بادشاہ وقت قطع نظر اس کے کہ وہ خود پابند شریعت ہوتا یا نہ ہوتا لیکن محافظ دین اور حامئ شریعت ضرور ہوتا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر اس تمام عمارت کا انحصار تھا۔ تو پھر قانون شریعت کی بے کسی اور دین اسلام کی کسمپرسی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ کفرستان ہند میں ان دنوں سفینۂ اسلام کی یہ حالت تھی۔ جیسے کوئی جہاز بغیر بادبان اور بغیر لنگر کے بحر بیکنار میں طوفان کے تھپیڑے کھا رہا ہو۔ گویا

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

اللہ اللہ کیسا عبرتناک دور تھا۔ کہ علماء آپس کے مناقشوں میں مصروف تھے۔ اور صوفیائے کرام ترہات تصوف کے نشہ اور وحدت الوجود کی بوالعجبیوں میں سرشار

تصوف طریقت شریعت کلام بتان عجم کے پجاری تمام

بادشاہ ایک لادینی ریاست کے قیام کا طلب گار تھا۔ اور امرائے دربار خوشامد طلبی میں مصروف اور بادشاہ کی نگاہ لطف کے خواستگار تھے۔ اسلام اور کافۂ اہل اسلام کی کسمپرسی سر آنکھ

کے لئے سامان عبرت تھی ۔ نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ مسلمانوں کے لئے شعار اسلامی پر عمل کرنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اصول دین وارکان دین کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں چند ایک تاریخی شہادتیں اس مضمون کی وضاحت کے لئے یقیناً مفید ہوں گی ۔ ملا عبد القادر بدایونی جو حمایت دین سے بے بہرہ تھے ۔ اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں جا بجا اس حالت پر نوحہ کناں ہیں اسلام کی غربت کی تصویر وہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ۔

" بر رغم اسلام ہر حکمے کہ ارباب ادیان دیگر بیان می کردند ۔ آں نص قاطع شمردند ۔ بخلاف دین ملت (اسلام) کہ ہمہ آں نامعقول و حادث و واضع آں فقرائے عریاں "

ترجمہ :- اسلام کی ضد اور اس کے توڑ پر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا ۔ اس کو بادشاہ نص قاطع اور قطعی دلیل خیال کرتے تھے ۔ بخلاف اسلامی ملت کے کہ اس کی ساری باتیں مہمل اور نامعقول نو پیدا عرب کے مفلسوں کی گھڑی ہوئی چیزیں خیال کی جاتی تھیں ۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

بعد از پنج شش سال اثرے اسلام نماند و قضیہ منعکس شد

ترجمہ :- پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا ۔ اور بات بالکل الٹ گئی ۔ اور ایک اور اندراج دیکھیے اور اسلام کی غربت پر آنسو بہائیے ۔

" عربی خواندن و دانستن آں عیب شد و فقہ و حدیث و تفسیر و خوانندہ ۔ آں مطعون و مردود "

ترجمہ :- عربی پڑھنا اور اس کا جاننا عیب میں شمار ہونے لگا ۔ اور فقہ حدیث و تفسیر کو اور اس کے پڑھنے والوں کو مردود مطعون ٹھہرایا گیا ۔

آگے چل کر ملا صاحب فرماتے ہیں :- مدارس و مساجد مندرس ، علماء اکثرے جلا وطن شدند و اولاد ناقابل ایشاں کہ بماند بمردر پاجی نام بر آوردند :-

ترجمہ :- مسجدیں اور مدرسے سب ویران ہیں ۔ اکثر اہل علم جلا وطن ہو گئے ۔ ان کی نالائق اولاد جو ملک میں رہ گئی ہے ۔ پاجی گیری میں نام پیدا کر رہی ہے ۔

اکبری دور میں اسلام اور اہل اسلام جس درجہ غریب ہو چکے تھے۔ اس کا ذکر حضرت امام ربانی کی زبان قلم سے بھی سن لیجئے۔

" غربت اسلام نزدیک بہ یک قرن بہ نہجے قرار یافتہ است۔ کہ اہل کفر بہ مجرد اجرائے احکامِ کفر بر ملا در بلاد اسلام راضی نمی شوند۔ مے خواہند کہ احکام اسلامیہ بالکلیہ زائل گردند واثرے از مسلماناں و مسلمانی پیدا نہ شود۔ کار تاباں سرحد رسانیدہ اند۔ کہ اگر مسلمانے از شعائر اسلام اظہارے نماید بہ قتل می رسد۔

ترجمہ :۔ اہل اسلام کی غربت ایک زمانہ میں یہاں تک پہنچی کہ اہل کفر احکام کفر کے اجراء پر راضی نہیں۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں۔ کہ احکامِ اسلام قطعاً زائل ہو جائیں۔ اور مسلمان یا مسلمانی کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو مسلمان شعائر اسلام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ تو اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔

ان دو معتبر گواہوں کی شہادت کے بعد اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اب ہمیں کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہ جاتی۔ اکبر نے جس لادینی ریاست کا قیام ۹۸۰ھ کے قریب دیکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی تعبیر آخر کار اس رنگ میں ظاہر ہوئی کہ علمائے وقت ذہنی اعتبار سے مفلوج ہونے کے علاوہ دربار شاہی کے معتوب بھی تھے۔ حق گوئی کی پاداش میں. بہت سے اہل علم یا تو مرتبہ۔ شہادت پر سرفراز ہو چکے تھے۔ اور یا حلقہ بگوش دربار شاہی۔۔ بہت سے ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے گوشہ عافیت کو غنیمت جانا۔ اور اس دور ابتلا میں جان بچالے جانے ہی کو اپنی. بہت بڑی کامیابی سمجھا صوفیائے کرام کی حالت علماء سے بھی زیادہ خوار و زبوں تھی۔ ایسے وقت میں اگر کہیں سے شعاعِ اُمید نظر آتی ہے۔ تو وہ کیتھل کی اس مجلس میں سے جہاں ایک دانائے روزگار وقت کی نبض کو ہاتھ میں لیے۔ ایسے افراد کی تربیت کر رہا ہے۔ جنہوں نے آگے چل کر نہ صرف یہ کہ ان حالات کو سراسر بدلنا بلکہ مخالفانہ قوتوں کا مقابلہ بھی کرنا ہے۔ اعلحضرت کے روشن ضمیر پر آنے والے حالات کا پر تو پڑ چکا تھا۔ شیخ عبد الاحد سرہندی کی اولاد نرینہ میں سے خصوصیت کے ساتھ

چوتھے فرزند پر اپنی نگاہ شفقت اور نظرِ توجہ ڈالتے ہیں۔ شیخ عبدالاحد بھی اس راز کے شناسا اور اس سرِنہاں سے آگاہ ہیں۔ وہ بار بار اس سروِ بوستان اسلام کو اعلحضرت کی مجلس میں لاتے ہیں۔ کہ اس نونہال پر وہ نگاہیں زیادہ سے زیادہ اثرانداز ہوں جن میں مٹی کو سونا بنادینے کی اکسیری خاصیت تھی۔ یہ محض اتفاقات کا کرشمہ نہیں ہو سکتا۔ کہ سب سے اول خانوادہ فاروقی کے اس گھرانہ کو اعلحضرت کی نگاہ دوربین انتخاب کرتی ہے۔ کہ جن کی رگ فاروقیت ہر خلافِ شرع فعل پر بھڑک اٹھتی تھی۔ جب شیخ عبدالاحد آپ کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں۔ تو انہیں ایک ایسے فرزند کی آمد کی خوشخبری سنائی جاتی ہے۔ جو آئندہ چل کر قصر اسلام کی ویرانی کو رونق وصفا سے تبدیل کرنے والا تھا۔ اور جس کے علم وعمل کی طاقتیں اسلامِ ہند میں اپنا کوئی جواب نہ پیش کر سکتی تھیں۔ اور پھر ان شیخ احمد سرہندی پر آپ کی شفقت کا یہ عالم تھا۔ کہ انہیں ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ اور اس جوہر قابل کا بھی یہ حال تھا۔ کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے دل پر نقش ہوتا چلا جاتا تھا۔ حضرت مجددالف ثانی کی عمر یوں تو دس سال کی تھی۔ لیکن قدرت نے انہیں جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں۔ وہ ایسی تھیں کہ ان کی بدولت یہ اس عمر میں بھی بوڑھوں سے زیادہ فہم وذکا۔ اور پیرانِ عمر رسیدہ سے زیادہ ذہن رسا رکھتے تھے۔ وہ چنگاری جو آئندہ چل کر اسلامی ہند کے لئے ایک روشنی کا مینار ثابت ہوئی۔ آخر وہ ان کے دل میں حضرت شاہ کمال قادری کی مجلس ہی میں تو روشن ہوئی تھی۔ اور وہ شعلہ کہ جس نے خس وخاشاک باطل کے انبار کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ان کے سینہ سے اسی دانائے روزگار کی آتش نوائی ہی سے تو بھڑکا تھا۔ اور اس استاد کامل نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنی رحلت کے بعد ان کی تربیت کا انتظام والصرام حضرت شاہ سکندر رؤس کے سپرد کر دیا۔ کہ وقت کی کمی کے سبب جو کمی رہ گئی تھی۔ وہ یہاں سے پوری ہو جائے۔

وفات:۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم خاکی میں ہر ذی روح کو ایک خاص وقت اور ایک مخصوص

مقصد کے لئے بھیجا ہے۔ جب وہ مقصد تکمیل پا جاتا ہے۔ کہ جس کے لئے اسے تخلیق کیا گیا تھا۔ تو اسے واپس بلا لیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ کمال قادریؒ نے جب اپنے مقصد تخلیق کی تکمیل کر دی تو انہیں بھی وہ پیغام مراجعت آگیا۔ کہ جو ازل سے ہر ذی روح کے لئے مقدر ہے۔ چنانچہ جمادی الاخر کی ۹ ۰ تاریخ اور سن ۹۸۱ تھا جب آپ نے اس دار فنا سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔ روایت ہے کہ کافی عرصہ پہلے آپ پر دنیا اور اہل دنیا سے بے تعلقی کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ کئی کئی دن تک آپ بے آب ودانہ اپنے حجرہ مبارک میں محو مراقبہ رہتے۔ ایسے عالم میں کسی کی جرات نہ تھی۔ کہ آپ کے حجرہ میں قدم رکھ سکتا۔ آپ پر سُکر کی یہ کیفیت یوں طاری ہوتی تھی کہ بعض اوقات خدام درگاہ پریشان ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کئی دن گذر گئے۔ آپ نے دروازہ نہ کھولا۔ ایک شخص دور دراز سے بہ شوق زیارت و آستاں بوسی یہاں آیا تھا۔ کئی دن انتظار میں گذر گئے تو اس کا اضطراب بڑھنا شروع ہوا۔ وہ اپنے جذبہ شوق پر قابو نہ پا سکا۔ اچانک دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ آپ کو دیکھا تو یوں لیٹے ہوئے تھے جیسے بدن روح سے خالی ہو چکا ہو۔ اس نظارہ سے یہ مرد خدا نہایت غمگین ہوا۔ اور یہ اندوہگیں خبر باہر آکر لوگوں سے بیان کی۔ آپ کی وفات کی اطلاع کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک مخلوق خدا وہاں جمع ہو گئی۔ لیکن حجرہ کھولا گیا تو آپ پر سے یہ کیفیت دور ہو چکی تھی۔ اور آپ حسب معمول اپنے معمولات میں مشغول تھے۔ روایت ہے کہ بارہا لوگوں کو اسیطرح غلط فہمی ہوئی۔ دراصل یہ موت سے قبل موت سے ہمکنار ہونا تھا۔

آپ کے وصال کا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ قصر عارفاں سے روایت ہے کہ بسا اوقات تین تین ماہ بغیر کھائے پیئے ریاضت وعبادت میں مصروف ہوتے تھے۔ خلاف معمول چار ماہ گذرنے پر اہل خانقاہ نے سمجھا کہ آپ انتقال کر گئے ہیں۔ تجہیز و تکفین کے دوران آپ نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ غسال پر ہیبت طاری ہوئی۔ خادم سے پوچھا۔ کیا ہمارے انتقال کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی ہے۔ پھر خود ہی فرمایا حقیقت تو یہی ہے۔ اچھا ہم جاتے ہیں۔ اسی وقت انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ()

ان حضرات کی زندگی اور موت دونوں باہم اس طرح مربوط تھیں ۔ کہ ان کی زندگی سے موت کو اور موت سے زندگی کو الگ کرنا دشوار ہے ۔ نہ ان کی زندگی عام انسانوں کی سی زندگی تھی ۔ اور نہ ان کی موت اوروں جیسی تھی ۔ ان کی زندگی بھی ایک خصوصیت رکھتی تھی ۔ اور ان کی موت بھی ایک انفرادیت کی حامل تھی ۔ حق یہ ہے کہ زندگی ہے تو ان دوستانِ خدا کی زندگی کہ جب تک جیئے خالق کی رضا جوئی میں منہمک رہے ۔ اور جان دی تو واصل بحق ہوئے ۔ زندہ رہے تو فیض رسائی خلق میں مشغول رہے ۔ اور مرے تو حیات جاوداں سے ہمکنار ہوتے پیر رومی نے کیا خوب فرمایا ہے

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

ان کی مطمع نظر یہ ارشاد ربانی تھا۔

ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین ۔

(میری عبادت ، میری قربانیاں ، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو جہانوں کے پالنے والا ہے) اس آیت قرانی کا مفہوم کسی اہل نظر نے دو شعروں میں ادا کیا ہے ۔ اور حق یہ ہے کہ خوب کیا ہے ۔ اور یہ شعر میرے نزدیک اس واسطے بھی وقیع ہیں کہ یہ حضرت مسعود فرید الدین گنج شکر کے ورد زبان رہتے تھے ۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم
خاکے شوم بزیر پائے تو زیم

مقصود من خستہ ز کونین توی
از بہر تو میرم از برائے تو زیم

یہ وہ برگزیدگان عالم انسان ہیں ۔ جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

یاایتہا النفس المطمئنۃ ۔ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ۔ فادخلی فی عبدی وادخلی جنتی

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آپ نے کیتھل میں اپنی مستقل رہائش کے لئے جس مقام کو منتخب کیا تھا ۔ یہ شہر سے تقریباً ایک میل دور جانب شرق واقع تھا ۔ اس کے نواح میں مطلقاً کوئی آبادی نہ تھی ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بادشاہی باغ تھا ۔ جس کے باقیات الصالحات میں سے کھرنی اور املی کے درخت تو اب تک بھی روضہ مبارک کے احاطہ کے اندر موجود تھے ۔ یہ جگہ سطح زمین سے کافی

بلند تھی۔ یوں کہیے کہ یہ ایک مسطح ٹیلہ تھا۔ اس مقام کے مغرب میں ایک۔ بہت بڑا تالاب تھا۔ کہ جہاں برسات کا پانی جمع ہو کر ایک اچھی خاصی جھیل کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں جو باغ تھا اس کی سیرابی رہٹ وغیرہ کے ذریعے اس ذخیرہ آب سے ہوتی ہو۔ آپ کا وہ حجرہ جس میں آپ دم واپسیں تک مقیم رہے۔ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اور اس کے آثار قیام پاکستان تک موجود تھے۔ یہی وہ حجرہ تھا۔ کہ جہاں آپ فیض رسائی خلق میں مشغول رہتے تھے۔ اس حجرہ ہی میں وہ فخر روزگار ہستیاں بھی آ کر بیٹھتی تھیں کہ جن کے کارناموں سے اوراق تاریخ مزین ہیں۔ یہی حجرہ تھا جہاں دن رات انوار و تجلیات کی بارش برستی تھی۔ جامع مسجد شاہ کمال مغلپورہ لاہور۔ ملتان لدھیانہ دیپالپور۔ کمالیہ۔ پاٹل۔ سمانہ۔ ٹھٹھ ضلع سانگھڑ میں جن جن مقامات پر بھی آپ نے چلہ کشی کی وہ مقامات مرکز انوار بن گئے۔ آپ کا مزار اس مقام سے سو یا ڈیڑھ سو قدم کے فاصلہ پر جانب شمال یوں ہے کہ حجرہ عین اس کے محاذ میں ہے۔ گویا بعد وفات بھی یہ حجرہ اس کے حاضرین اور یہاں کی مجالس آپ کی نظروں کے سامنے رہے۔ اپنے کام کو انجام تک پہنچانے کی تڑپ ان عظیم ارواح کا خاصہ ہے۔ اور ان کی حیات جاوید کا راز بھی شاید اسی تڑپ میں مضمر ہے۔

مجھے باوجود تجسس کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ کے روضہ کی تعمیر کی سعادت کس کے حصہ میں آئی۔ بہر حال آپ کی تربت پر ایک شاندار روضہ اس عقیدت کا مظہر تھا۔ جو عوام و خواص کو آپ سے تھی۔ روضہ کی پشت پر درویشوں کے مساکن اور روضہ کے سامنے وسیع و عریض پختہ چبوترہ تھا۔ اسی احاطہ میں ایک کنواں بھی تھا۔ جس کے پانی کی ٹھنڈک اور شیرینی دور دور تک مشہور تھی۔ ہاں! وہ پانی کیوں نہ شیرینی و صفات میں خصوصیت پیدا کرتا۔ کہ جسے آپ جیسے کامل و اکمل کی دست و پابوسی کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ خاکسار مصنف کو بہت سے اولیائے کرام کے مزارات پر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن سکون و سکوت اور کیف و سرور کی جو فضا یہاں پائی۔ وہ اور کہیں کم نظر آئی۔ شام کے وقت روضہ منورہ کے چبوترے پر کھڑے ہو کر مغرب رخ دیکھنے سے عجیب نظارہ نظر آتا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعیں جب اس تالاب کے پانی پر پڑتی

تھیں۔ تو ایک دریائے حسن موجیں مارتا نظر آتا تھا۔ پرے حد نگاہ تک قلعہ کی عمارتیں اس چکا چوند کے عالم میں یوں معلوم ہوتی تھیں۔ کہ جیسے انہیں کسی نے آب زر سے نہلا دیا ہو۔ نگار فطرت کی اس نمائشِ جمال سے جو کیف ان وجدانی لمحات میں حاصل ہوا۔ اس کا نقش دل پر لافانی ہے۔ علامہ اقبال نے اس فضائے نور و سرور کا مشاہدہ دشت نواح کاظمہ کی ابھرتی ہوئی صبح میں کیا تھا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں ؛ چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

لیکن میں نے فطرت کے اس جمال جہاں آرا کا مشاہدہ شام گیتھل میں کیا ہے۔ کہ جس کی کسک تمام عمر دل میں رہے گی۔

تہنیت گو ئید مستاں را کہ سنگ محتسب ؛ بردل ما آمد وایں آفت از مینا گذشت

اعلٰحضرت کی کوئی علمی تصنیف مجھے نہیں ملی۔ اور نہ کوئی ایسا سراغ ملا۔ کہ جس سے آپ کی مصنفانہ مشغولیت کا علم ہو سکتا۔ چند ایک خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو آپ نے مختلف اوقات میں بعض اصحاب کو لکھے ہیں مکتوبات کے مطالعہ سے وہ ذوق و شوق اور وارفتگی عشق ظاہر ہوتی ہے۔ جو آپ کے کردار کا عمر بھر خاصہ رہی۔ یہ مکتوبات معہ ترجمہ ہدیہ ناظرین ہیں۔

اعلٰحضرت کے خطوط کا یہ مجموعہ نقل در نقل کے بعد مجھ تک پہنچا ہے۔ جتنی نقلیں بھی میرے پاس تھیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے۔ اور ایک ایک فقرہ پر غور کیا ہے۔ پھر بھی عین ممکن ہے کہ بعض مقامات پر غلطیاں رہ گئی ہوں۔ چونکہ ان تمام نسخوں میں ہم آہنگی اور ربط موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کئی الفاظ بلکہ فقروں کے متعلق مجھے "اجتہاد" سے کام لینا پڑا ہے۔ اور اجتہاد ظاہر ہے کہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ یہی عالم ترجمہ کا ہے۔ امید ہے کہ قارئین "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل فرمائیں گے۔

قطب الاقطاب حضرت شاہ عبداللہ سکندر روس محبوب الٰہی قادری کیتھلی

ولادت باسعادت:۔ جمعہ کا روزِ سعید تھا۔ اور ماہ رجب کی تیرہ تاریخ جبکہ ۹۵۹ھ میں یہ بدر منیر افق عالم پر طلوع ہوا۔ آپ کے والد محترم شاہ عمادالدینؒ چند ماہ قبل کیتھل سے رخصت ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ کمالؒ کے عتاب و جلال کا آفتاب جب مائل بہ حدت ہوتا تھا۔ تو اس کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہر سکتی تھی۔ حضرت شاہ عمادالدینؒ جب زیرِ عتاب آئے۔ تو انہیں گھر سے نکلتے ہی بن پڑی۔ جس خطہ ارض پر آفتاب عالم تاب کی شعاعیں اپنی روشنی ڈالنا چھوڑ دیں۔ وہاں کی تاریکی و ہولناکی کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ حضرت شاہ سکندر کی ولادت کے وقت شاہ عمادالدینؒ موجود نہ تھے آپ کی پیدائش کی مسرت کا لطف اعلیٰحضرت نے اٹھایا یا آپ کی والدہ ماجدہ کے حصہ میں آیا۔ جب کوئی اہم واقعہ اس تیرہ خاندان میں رونما ہونے کو ہوتا تو اس کے اثرات پہلے ہی سے نظر آنا شروع ہو جاتے تھے۔ اعلیٰحضرت کے ضمیر منیر پر آپ کی پیدائش کی بشارت ثبت ہو چکی تھی۔ خدام درگاہ اور متعلقین کے سامنے آپ نے ایک وارث خاندان کے ورود مسعود کی اطلاع دی تھی۔ لیکن قدرت نے آپ کی والدہ محترمہ کو بھی اس راز کی آگہی سے محروم رکھنا گوارا نہ کیا۔ آپ کی والدہ محترمہ صحیح النسب سیدہ ولیہ۔ کامل اور حافظ قرآن تھیں۔ آپ کی ولادت سے قبل ہر روز نئی سے نئی واردات کا مشاہدہ فرماتی تھیں۔ روایت ہے کہ آپ کی والدہ نے ایک شب بحالت خواب دیکھا۔ "کہ آسماں سے ماہ کامل اترا۔ اور میری گود میں آن بیٹھا" ندا آئی کہ یہ تیرے فرزند کی پیدائش کا وقت ہے۔ یہ روشنی اس کے دل کا نور ہے۔ ایک مرتبہ یوں نظر آیا کہ ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ جس میں غضب کی موجیں اٹھ رہی ہیں۔ اور اس بحر طوفان خیز میں ایک خستہ و شکستہ کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔ گویا

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل

قریب ہے کہ طوفان بلا کی تاب نہ لا کر یہ سفینہ ڈوب جائے۔ کہ اچانک غیب سے ایک ہاتھ

نمودار ہوتا ہے۔ اور وہ کشتی کو کھینتا ہوا صحیح و سلامت کنارِ ساحل پر لے جاتا ہے۔ یہ خواب اعلیحضرت کی خدمت میں عرض کیے جاتے ہیں آپ سن کر صرف مسکرا دیتے ہیں۔ یا کبھی زبان فیض ترجمان سے ارشاد بھی فرماتے ہیں۔ تو فقط اتنا کہ اس خواب کی تعبیر عنقریب، ظاہر ہونے والی ہے۔ تاآنکہ یہ بشارتیں اور پیشگوئیاں پوری ہوئیں۔ اور ان رویائے صادقہ کی تعبیر بھی نکل آئی جو آپ کی والدہ ماجدہ کو نظر آیا کرتے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت کی اطلاع جب آپ کے جد محترم حضرت اقدسؒ کو ملی۔ تو آپ بے ساختہ مشکوئے معلی میں تشریف لے گئے۔ نومولود جو آپ کے گھر کا ماہ چہاردہم تھا۔ اسے اٹھا کر آپ نے بے اختیار چوم لیا۔ آپ کی ہر حرکت سے مسرت و انبساط کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ کہ آج اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں بھیج دیا تھا جس کا مدت سے آپ کو انتظار تھا۔ اور جو بڑا ہو کر آپ کی تمام امانتوں کا بار اٹھانے والا تھا۔ خاندان میں جس بار کو کوئی نہ اٹھا سکا تھا۔ اسے آخر حضرت شاہ سکندر روسؒ ہی نے سنبھالا تھا۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید — قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

کانوں میں اذان و اقامت کہنے کے بعد آپ نے اپنی چھنگلی انگلی نومولود کے منہ میں ڈال دی جسے وہ چوستے رہے۔ اور نہیں معلوم اس ذریعہ سے کتنے انوار و اسرار آپ کے سینہ میں منتقل ہو گئے۔ روایت ہے کہ متواتر چھ ماہ تک آپ یہ عمل کرتے رہے۔ روایت ہے کہ آپ نے ماہ رمضان میں دن کے وقت دودھ نہیں پیا۔

سلسلہ نسب جدی:۔ آپ کا سلسلہ نسب پندرہ واسطوں سے سیدنا عبدالقادر جیلانیؓ تک منتہا ہوتا ہے جس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔ ۱) شاہ سکندرؒ۔ ۲) شاہ عمادالدینؒ۔ ۳) شاہ کمالؒ۔ ۴) سید حاجی عمرؒ۔ ۵) سید حاجی عثمانؒ۔ ۶) سید حسین شاہؒ۔ ۷) شاہ موسیٰ ثانیؒ۔ ۸) شاہ محمد یوسفؒ۔ ۹) جمال علی۔ ۱۰) شاہ نور الدینؒ۔ ۱۱) ابراہیم ابرارؒ۔ ۱۲) نظام الدینؒ۔ ۱۳) ابو محمد عبد القادرؒ۔ ۱۴) عبدالرحمن لقب عبداللہؒ۔ ۱۵) شیخ الجن والانس سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ۔

سلسلہ۔ نسب مادری:۔ سیدہ بی بی حسیبہ دختر سید علی اکبر۔ سید خدائیہ۔ سید عثمان سید عبداللہ ابن ملک سید قطب الدین اولاد امجاد سید کمال ترمذیؒ۔

یہ ملک سید قطب الدینؒ زہد و اتقا میں یگانہ۔ روز گار ہونے کے علاوہ ریاست و امارت کے حامل بھی تھے۔ حضرت سید کمال ترمذیؒ کے خاندان کے متعلق گذشتہ اوراق میں مفصل لکھا جا چکا ہے۔ اس خاندان میں بڑے بڑے صاحب علم و فضل بزرگ گذرے تھے۔ یہی ایک ایسا خاندان تھا۔ جسے حضرت شاہ کمال قادریؒ نے رشتہ و پیوند کے لئے منتخب فرمایا۔ اور یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ آپ اس سفر ہجرت میں فقط اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لائے تھے۔ اولاد کے جوان ہونے پر عزیزان وطن سے یہ تعلق قائم ہونا ناممکن تھا۔ یہی مناسب تھا کہ کسی نجابت و شرافت سے بہرہ ور خاندان سے اس قسم کے تعلقات قائم کیے جائیں۔ ترمذی خاندان جو ان صفات سے بہرہ ور تھا۔ اسی پر آپ کی نظریں پڑی۔ روایت ہے کہ حضرت شاہ سکندرؒ جبکہ نہایت ہی کمسن تھے۔ آپ کو تلاوت قرآن مجید کی سماعت سے غایت درجہ لگاؤ تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ جب تلاوت فرمایا کرتیں۔ تو آپ ہمہ تن گوش ہو کر اس نغمہ جاں نواز کو سنا کرتے تھے۔ اور پہروں تک اس سے لطف اندوز ہوتے۔ اور آپ پر ایسا استغراق کا عالم طاری ہوتا تھا کہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتے تھے۔ اور یہ ذوق جو عالم شیر خوارگی میں آپ کو ودیعت ہوا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ کامل و اکمل ہوتا چلا گیا۔ ایک مرتبہ آپ کی والدہ ماجدہ نے دیکھا کہ آپ پنگھوڑے میں سوئے ہوئے ہیں اور ایک سیاہ سانپ مگس رانی کر رہا ہے۔

تعلیم:۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا۔ تو آپ کو ایک ایسی درس گاہ اور تربیت گاہ میسر آئی۔ جو بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ اعلحضرتؒ کی مجلس کی تابناکی و درخشانی کا یہ عالم تھا۔ کہ چاند سورج بھی اس پر رشک کرتے تھے۔ حضرت اقدسؒ آپ کو عزیز بھی بے حد رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کا زیادہ وقت بامر جد محترم کے پاس ہی گذرتا تھا۔ اعلحضرت بایں ہمہ رعب و جلال آپ کی

نازبرداریاں کیا کرتے تھے۔ مجلس کا موضوع چاہے کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو۔ شاہ سکندر اپنے عہد طفلی کی رعنائیوں کے ساتھ جب اس مجلس میں قدم رکھتے تھے تو حضرت اقدس فوراً ان کی طرف رخ کر لیا کرتے تھے۔ ان کی طفلانہ باتوں کو غور سے سنتے۔ اور معصوم سوالات کا جواب نہایت انہماک سے دیا کرتے تھے۔ یہ سوال و جواب بھی بجائے خود کسی اعلیٰ درجہ کے مدرسہ کی تعلیم سے کم نہ ہوتے تھے۔

روایت ہے کہ جب آپ چار سال چار ماہ اور چار دن کے ہوئے۔ تو آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ قدیم سے رواج چلا آتا ہے۔ کہ جب بچوں کی مکتبی تعلیم کی ابتدا۔ کی جاتی تھی تو یہ ایک اچھی خاصی تقریب بن جاتی تھی۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق اہتمام کرتا تھا۔ یہ تو اعلحضرت کے نور نظر تھے۔ ان کے لئے تو ظاہر ہے کہ بڑا اہتمام ہوا ہو گا۔ اس تقریب کا نام ہی "بسم اللہ" کی تقریب ہے۔

روایت ہے کہ جب آپ کو مکتب میں داخل کرایا گیا۔ آپکے استاد نے آپ کو "الف" پڑھنے کو کہا۔ آپ نے کہا "الف" پھر استاد نے کہا پڑھو "ب" آپ نے جواب دیا کہ "الف پڑھ لیا ہے۔ یہی کافی ہے" "ب" کی ضرورت نہیں"۔

آپ نے پھر "الف" کے اتنے معانی و حقائق بیان کیے کہ استاد کو سخت تعجب ہوا۔

سید محمد یوسف غوث آپ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل آپ نے بہت جلد طے کر لیے۔ آپ کے اساتذہ میں کیتھل کے نامور فاضل اور اطراف و اکناف کے دیگر صاحب علم بزرگ رہے ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی مجھے مل سکے ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:-

سید محمد یوسف نام لقب غوث:- صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ زیور علم و فضل سے بھی آراستہ تھے۔ اعلحضرت سے بیعت تھے۔ اور ہمہ وقت آستانہ عالیہ پر حاضر رہتے

تھے۔ یہ بھی ایک مرتبہ اعلحضرت کے زیر عتاب آتے تھے۔ لیکن بچ نکلے۔ ان کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔

قاضی عبد الرحمن پائلی:۔ پائل ایک مشہور مردم خیز قصبہ تھا۔ اعلحضرت نے وہاں بھی کیتھل میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے قبل قیام کیا تھا۔ پائل کی بیشتر آبادی آپ سے عقیدت وارادت رکھتی تھی۔ قاضی صاحب خصوصیت سے آپ کی نگاہ التفات سے بہرہ ور تھے۔ انہیں بھی حضرت شاہ سکندر کو تعلیم دینے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

خواجہ عین الدین اور خواجہ محمد اسحاق:۔ یہ دونوں بزرگ بھی آستانہ عالیہ کے متوسلین میں سے تھے۔ اور صاحب علم و فضل تھے۔ ان اساتذہ کے علاوہ براہ راست اعلحضرت کی نگرانی اور ہدایات سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہوں گی۔ عربی آپ کے گھرانے کی زبان تھی۔ اور فارسی ملک کی مروجہ زبان تھی۔ آپ نے دونوں زبانوں میں مہارت تام حاصل کی۔ قرآن پاک کا ذوق آپ میں فطری ہونے کے علاوہ والدہ محترمہ کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ تصوف کی بلند نظری اور طریقت کی پاک بینی آپ کا ورثہ تھا۔ جسے آپ وقت گذرنے کے ساتھ حاصل کرتے چلے گئے۔ کتابوں اور مدرسوں سے لوگ جو استعداد سالہا سال میں حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے وہ چند دنوں میں حاصل کرلی۔ روایت ہے کہ بعض اوقات آپ اپنے اساتذہ سے ایسے ایسے سوالات کیا کرتے۔ کہ انہیں جواب دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ آخر وہی دانائے روزگار حبیں کی مجلس کے خوشہ چیں شیخ عبد الاحد سرہندیؒ اور شیخ جلال الدین تھانیسریؒ جیسے علامہ روزگار تھے آپ کی باتوں کا جواب دیا کرتے تھے۔ آپ کی پندرہ یا سولہ سال کی عمر تھی۔ جبکہ آپ نے تمام مروجہ علوم پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ مکتب وملا کی قید سے آزاد ہونے کے بعد وہ مقام آیا۔ جہاں نہ کتاب کام کرتی ہے اور نہ علوم و فنون دستگیری کرتے ہیں۔ اگر کچھ کام آتی ہے تو مرشد پاک بین کی نگاہ کیمیا اثر۔ کہ وہ سوز جس سے اعمال میں حسن و دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ اسی نگاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابی علم منزل نہیں رہنماتے

منزل ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق   عشق نہ ہو تو شرع و دیں تبکدۂ تصورات

جنہوں نے منزل حیات میں عشق کی روشنی میں رہنمائی حاصل نہ کی۔ وہ تصورات کے بتکدہ میں اسیر ہو کر رہ گئے۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

وہ علم جو صرف تن پروری کا ذریعہ یا شوکت و شہرت کا سبب ہو۔ اس علم سے بجز عجب و غرور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جس علم سے معرفت نفس حاصل نہ ہو۔ ور جو علم حسن ازل کی خوشہ چینی میں معاون نہ ہو۔ وہ علم نہیں روح و دماغ کے لئے زنگ ہے مرشد رومی نے کیا خوب فرمایا ہے

علم را بر دل زنی یارے شود   علم را بر تن زنی مارے شود

لیکن یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ یہ منزل علم میں کمال حاصل کرنے کے بعد آتی ہے۔ علم کے بغیر کوچہ درویشی میں قدم رکھنا ایسا ہی ہے۔ کہ کوئی کشتی بے لنگر و بے بادبان بحر ذخار کو عبور کرنے کی کوشش کرے۔ جن بزرگوں کے سر پر آج تاج ولایت نظر آتا ہے۔ پہلے انہوں نے مکتب و مسجد کے کوچہ کی خاک چھانی ہے۔ پھر اس طرف رجوع کیا ہے۔ قرآن پاک نے علم کے چار ذرائع ذہن انسانی کے لئے مہیا کیے ہیں۔ ایک تو وحی ربانی کہ جس کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ دوسرے آثار قدیمہ و تاریخ تیسرے علم النفس اور آخری ذریعہ صحیفہ فطرت ہے۔ ان علمی ذرائع سے آگاہی بہر حال مکتب کی فضا ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ علم النفس ہی وہ علم ہے۔ کہ جس کی بنیاد پر صوفیائے کرام نے ریاضت و مجاہدہ اور سلوک و معرفت کی عمارت تیار کی نفس کے ساتھ جہاد کیے بغیر روحانی کیفیات روشن نہیں ہو سکتیں۔ بشری خامیوں اور انسانی کمزوریوں پر قابو پانے کا ذریعہ جہاد فی النفس ہے۔ اپنی ذات کی معرفت، حقائق عالم سے آگہی اور انسان کی خلقت کا راز درویشی کی منزل اولین ہے۔ قرآن مجید کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے سے وہ لولوئے لالا ہاتھ

آجاتا ہے۔ کہ جس کا نام مقام معرفت ہے۔ اور یہیں سے اس ولایت کی ابتداء ہوتی ہے۔ جو نبوت کی نیابت کرتی ہے۔ حرص وہوا، بغض وحسد وغیرہ ایسے انسانی وروحانی امراض ہیں۔ کہ ان کی موجودگی میں انسان خلافت ارضی کا فریضہ بحسن وخوبی ادا نہیں کر سکتا۔ یہ مذکورہ عوارض روحانی اور دیگر امراض نفسانی دور ہوتے بغیر آئینہ دل میں حسن ازل کے جلووں کا انعکاس نہیں ہو سکتا۔ جب ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ منزل سلوک کا رہرو ان عوارض بشری کا بکلی استیصال کر دیتا ہے۔ تب وہ اس قابل ہوتا ہے کہ نیابت الٰہی اور ولایت کا تاج اس کے سر پر رکھا جاتے۔ اولیا اللہ کی تعریف اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے۔ الاان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون

ترجمہ:- اللہ کے دوست وہ ہیں جنہیں نہ کبھی خوف لاحق ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں رنج والم سے واسطہ پڑتا ہے۔ خلافت الٰہیہ اور نیابت نبوت کا منصب سنبھالنے کے بعد اولیاء اللہ یعنی اللہ کے دوست دین الٰہی اور شریعت محمدی کے اجراء تحفظ اور اسے آلائشوں سے صاف کرنے میں کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ خاتم النبین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد نبوت کا دروازہ تو قیامت تک کے لئے بند ہو چکا ہے۔ لیکن اس اہتمام کی بشدت ضرورت تھی۔ کہ وقتاً فوقتاً عالم اسلام میں ایسے سرفروش پیدا ہوتے رہیں۔ جو آفتاب نبوت کی روشنی میں دین اسلام کی حفاظت اور احیاء وتجدید کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ قرآن پاک اور دین اسلام کے ساتھ جو سلوک دشمنان دین نے دوستوں کے روپ میں کیا۔ وہ بشدت دردناک اور عبرتناک ہے۔ اور جس کا تذکرہ اس کتاب کی اولین ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے بارہ میں یہ شعر لکھنا کافی ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

اور اگر اسلام کے ان نادان دوستوں، یا دوستوں کے روپ میں دشمنوں کا وار چل جاتا اور داؤں کارگر ہو جاتا۔ تو آفتاب اسلام کی وہ شعاعیں جن سے ہر مسلمان کا سینہ منور ہے۔ اپنی درخشندگی وتابانی کو شاید کھو بیٹھتیں۔ لیکن قرآن پاک اور اسلام نے اولیاء اللہ کا ایک منصب قائم کیا ہے اور ان کے سپرد یہ فریضہ ہوا۔ کہ وہ ہر دور اور ہر زمانہ میں اسلام کی حفاظت حیات بجان ودل

کریں۔ اور دشمنان اسلام کی ہر ناپاک سعی کو ناکام بنادیں۔ اس راہ پر چلتے ہوتے۔ انہیں ہر قسم کی تخویف و تحریص کا نشانہ بننا پڑے گا۔ ظلم و ستم سہنے پڑیں گے۔ لیکن وہی اس مقام ولایت کے حقدار ہوں گے۔ کہ ہر قسم کے خوف و تشدد اور جبر و ظلم کے مقابلہ میں ان کے دل میں نہ ملال آئے اور نہ ان کی تیوری پر بل پڑے گا۔ ان کے پائے استقلال کو زمانہ کی کوئی کروٹ اور چرخ ناہنجار کی کوئی گردش جنبش نے دے سکے گی۔ میدان کربلا میں سبط نبیؑ کا اسوہ حسنہ اور مامون الرشید کے دربار میں امام احمد بن حنبل کا وطیرہ ہمارے بیان کی بہترین دلیل ہیں۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لئے دل کو ہر آلائش دنیوی سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام کچھ سہل نہیں۔ حیات جاوداں کی منزل دشواریوں سے بھرپور ہے۔ لیکن جن بزرگوں نے استقلال کو دلیل راہ بنایا۔ اور ہر دشواری کو باآسانی طے کرلیا۔ وہ آخر اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ یہاں عقل رہنمائی نہیں کرتی۔ یہاں عشق کی کارفرمائی کام کرتی ہے۔

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہست بسے
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

حضرت شاہ سکندرؒ کو اس منزل عشق و ولایت طے کرنے میں کتنے دن لگے۔ یہ تو کون بتا سکتا ہے۔ لیکن جب آپ اس مقام پر فائز ہوتے جس کا نام نیابت الٰہیہ اور مقام ولایت ہے تو پھر آپ کے ضمیر روشن اور قلب منور کی شعاعوں سے وہ دور چمک اٹھا۔ حضرت امام ربانی فرماتے ہیں

"کہ سورج کی طرف دیکھنا تو میرے لئے ممکن ہے۔ لیکن حضرت شاہ سکندرؒ کا قلب مبارک اس قدر روشن ہے کہ اس کی طرف میں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا"۔ حضرت شاہ سکندرؒ کے مرتبہ رفیع اور روشن ضمیری کے متعلق امام ربانی کی یہ شہادت بڑی وقیع ہے۔ اور اسی شہادت سے آپ کے بلند مراتب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حلیہ مبارک اور عادات و خصائل:۔ روایت ہے کہ حسن معنوی کے ساتھ اللہ

تعالیٰ نے جمال صوری سے بھی آپ کو بہرہ ور فرمایا تھا۔ جس طرح کاملین وقت کو آپ کے قلب مبارک پر نگاہ ڈالنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح تابش جمال کی فراوانی سے کوئی آدمی پوری طرح آپ کے چہرہ اقدس کی طرف نہ دیکھ سکتا تھا۔

بالائے سرش زہوش مندی　　　می تافت ستارہ بلندی

خدا نے آپ کی نگاہ میں وہ تاثیر بخشی کہ جس پر نظر کیمیا اثر پڑ جاتی اس کی کایا پلٹ جاتی۔ گنہگار تائب اور کافر مسلمان ہو جاتا۔ سبحان اللہ اہلِ حق کی نظر کس قدر پر تاثیر ہوتی ہے۔

اتم جن سے ملت ہے اوگن بھی گن ہو
کھن سنگت کھاری ادمی پر سو میٹھیت ہو

یعنی نیک لوگوں کی صحبت کے فیض سے برائیاں نیکیوں سے بدل جاتی ہیں۔ سمندر کا کھارا پانی جب بادل کے دامن میں پہنچتا ہے تو وہ شیریں ہو جاتا ہے۔

بلند وبالا۔ جسم نہ دبلا نہ مائل بہ فربہی۔ اعضا نہایت موزوں و متناسب چال میں وقار۔ آواز بلند و پر رعب۔ جب گفتگو کا آغاز فرمایا کرتے تھے۔ تو سامعین ہمہ تن گوش ہو جایا کرتے تھے۔ نہایت کم گو تھے۔ آنکھیں ایسی دلکش تھیں۔ کہ جب نظر اوپر اٹھاتے تھے۔ تو حاضرین وجد میں آ جایا کرتے تھے۔ زبان حد درجہ شیریں۔ اور انداز بیان نہایت دلکش تھا۔ مزاج کے نہایت حلیم اور بردبار تھے۔ لیکن جب کوئی امر خلاف شرع نظر آتا تھا۔ تو غضب وجلال میں آ جایا کرتے تھے۔ زندگی نہایت سادہ انداز میں گزارتے تھے۔ تکلفات سے مطلقاً کوئی سروکار نہ تھا۔ دریا دلی اور سخاوت کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ جو کچھ پاس ہوتا عطا فرما دیتے تھے۔ بحث ومناظرہ سے گریز فرماتے تھے۔ لیکن بات ایسی نپی تلی کرتے تھے۔ کہ کسی کو مجال اعتراض نہ ہوتی تھی۔ تصوف، شریعت اور طریقت کے خواص جس وقت آپ بیان فرمایا کرتے تھے۔ سامعین سر اور آنکھوں پر انہیں جگہ دیتے تھے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ علم لدنی خدا کی عطا ہے۔ یہ تحریری اور تقریری نہیں اور وہبی باتوں

کا بیان ممکن نہیں۔

لاہور کے ایک متبحر عالم دین قاضی صدر الدین کا بیان ہے کہ آپ کا انداز بیاں دلکش۔ آواز بلند اور صاف۔ خشک سے خشک موضوع کو بھی فصاحت و بلاغت سے ادا کرتے۔ آپ کی زبان کسی کی غیبت سے آلودہ نہ ہوتی تھی۔ اس لئے سامعین مجلس سے اٹھتے تو اپنے قلب کو پاکیزہ اور ذہن کو مصفا پاتے۔

جود و سخا:- ۱۔ بہ سلسلہ جود و سخا روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک سائل در اقدس پر حاضر ہوا۔ اتفاقاً نقد جنس کی صورت میں اس وقت آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ دوش مبارک پر سے ردا اتار کر سائل کو دے دی۔

۲۔ نذر نیاز اور ہدایا کی صورت میں جو کچھ آتا تھا۔ بالعموم فقراء و سائلین میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔

۳۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنی ناداری و عسرت کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ بوجہ عسرت وہ اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کر سکتا۔ آپ نے اسی وقت اپنی صاحبزادیوں کی شادی کا جو سامان تھا وہ حرم سرائے میں سے منگوا کر اس شخص کے حوالے کر دیا۔ خدام کو اگرچہ اس کا احساس بھی ہوا۔ لیکن آپ نے پروہ نہ کی۔ آخری وقت میں جود و عطا کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اگرچہ فتوحات و ہدایا بکثرت آتے تھے۔ لیکن آپ کی بخشش و سخاوت کے باعث گھر میں ہمیشہ عسرت ہی رہتی تھی۔

دن رات کے تمام اوقات تلاوت قرآن پاک اور نوافل کی ادائیگی میں گزارتے تھے۔ نماز باجماعت کا بشدت اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ نماز چاشت کے بعد دوپہر تک کا وقت احباب و معتقدین کی معیت میں گزرتا تھا۔ غذا نہایت معمولی اور تکلفات سے پاک ہوتی تھی۔ جو کچھ سامنے آ گیا۔ بے تکلف نوش جاں فرمالیا کرتے تھے۔ نماز ظہر سے کچھ دیر قبل قیلولہ کیا کرتے۔ نماز ظہر پڑھ کر

عصر تک کا وقت تلاوت قرآن پاک و مطالعہ کتب میں گذارتے تھے۔ نماز عشاء ادا فرمانے کے بعد استراحت فرماتے۔ اور ایک پہر رات باقی رہ جاتی تو بیدار ہو جاتے۔ فجر کے وقت تک نوافل اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے یہ ہے آپ کی زندگی کا مختصر سا نقشہ جو مختلف روایات کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ کہ اعلحضرت نے آپ کی دستار بندی کمسنی ہی میں کر دی تھی۔ جوں جوں یہ ہوش سنبھالتے چلے گئے۔ تمام کاروبار انہی سے متعلق ہو گیا۔ مہمانوں کی چونکہ کثرت رہتی تھی۔ درویش بھی در دولت پر حاضر رہا کرتے تھے۔ اس لئے لنگر خانہ کا کاروبار خاصا وسیع تھا۔ اور اس کا انتظام و انصرام آپ ہی کے ذمہ تھا۔ مختلف تذکرے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دربار کمالی کے معاملات کو آپ نے اس حسن انتظام، مستعدی اور لیاقت کے ساتھ انجام دیا۔ کہ کبھی کسی کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ مہمان نوازی کے سلسلہ میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات راتوں کو اٹھ کر مہمانوں کی قیام گاہ پر جاتے۔ اور ان کی ضروریات دریافت فرماتے۔ وہ مہمان جن کی تواضع زیادہ مقصود ہوتی تھی۔ یا جو آپ کی نگاہ میں زیادہ وقیع ٹھہرتے تھے۔ ان کے لئے کھانا خود لے کر جاتے تھے۔ اور انہیں اپنے سامنے کھلایا کرتے تھے۔ یتامٰے پر شفقت کا یہ عالم تھا۔ کہ ان کی پرورش بالکل اپنی اولاد اور اپنے خویش و اقربا کی طرح فرماتے تھے۔ طلباء و مساکین کا ایک گروہ ہمیشہ پاس رہتا تھا۔ طالبان حقیقت کی بھی کچھ کمی نہ تھی۔ جو دامن دولت سے وابستہ رہتے تھے۔ اتنے گوناں گوں اور ہمہ گیر معاملات کے متعلق جو وسیع پیچیدگیاں اور ضروریات پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی خبر کچھ انہیں اصحاب کو ہے۔ جو کسی ادارہ کے سربراہ ہوں۔ ان معاملات سے عہدہ بر آ ہونا۔ اپنے مشاغل میں بھی مصروف رہنا اور اپنے اوقات میں خلل نہ آنے دینا کچھ سہل نہیں ہے۔ لیکن حضرت شاہ سکندرؒ نے ان تمام امور پر مکمل اعتماد کے ساتھ عبور حاصل کیا۔ اور صاحبزادگان کے جوان ہونے تک تمام معاملات کی نگرانی آپ نے اپنے ہی سے متعلق رکھی۔ تعمیر خودی کی منزل میں یہ مقام بھی بہت اہم ہے۔ کہ معاملات دینوی میں مکمل غور و خوض کرنا۔ عملی دلچسپی لینا۔ اور ہر نوع کے معاملات کو سلجھانے کے لئے تگ و دو کرنا۔ لیکن اپنا یہ عالم

کہ ہر چیز سے بے نیاز اور ہر شے سے بے پروا۔ نہ سیم وزر کے جمع کرنے کی خواہش۔ نہ جائیداد بنانے کی تمنا۔ زخرفات دنیوی سے یوں پرہیز کرنا۔ گویا ایک متاع ہے۔ نادیدنی اور بے حقیقت۔ آج تو خیر زمانہ ہی اور ہے۔ اس وقت بھی ایسے دین فروشوں کی کمی نہ تھی۔ جو دینداری کے لبادہ میں دنیا داری و دنیا طلبی میں غرق رہتے تھے۔ اس سے بڑی نفس کشی اور کیا ہوگی۔ کہ انسان کی دسترس میں تمام سامان عشرت و آسائش ہو۔ لیکن وہ ہر شے راہ خدا میں لٹا دینے میں لذت محسوس کرے۔ اور خود فقر وفاقہ کی زندگی بسر کرے۔ اپنے سامنے سیم وزر کے انبار لگے دیکھے۔ لیکن ان پر ایک لمحہ کے لئے بھی ہوس کی نگاہ نہ ڈالے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے۔

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود ۔ ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

اس دنیا سے چلے تو خالی ہاتھ چلے۔ نہ دنیا اور نہ سامان دنیوی سے دل لگایا۔ کہ چلتے وقت تکلیف ہو۔ اور نہ ہی اپنے آپ کو مکروہات دنیا میں الجھایا۔ کہ نکلنا دشوار ہو جائے۔ اس اصول پر عمل تھا۔

راہ دشوار است ساماں کم بگیر ۔ درجہاں آزاد زی آزاد میر

خالق پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ ایک وقت کا آذوقہ مہیا ہو گیا۔ تو دوسرے وقت کی طلب سے بے نیاز۔ اگلے دن کے لئے وہ اٹھا کر رکھے جسے رب العلمین پر اعتماد نہ ہو۔

شادی تزویج :- اعلحضرت کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر مہلت دی۔ کہ آپ نے اس قراۃ العین یعنی حضرت شاہ سکندرؒ کی تعلیم و تربیت، اور پرورش بھی اپنی مرضی کے مطابق کرلی۔ اور شادی بھی اپنے ہاتھوں سے کی۔ اعلحضرت کے فرزند دوم ابوالمکارم شاہ موسیٰ قبولہ میں آباد ہو چکے تھے۔ ان کی شادی قصبہ کیتھل کے ترمذی خاندان میں ہوئی تھی۔ شاہ ابوالمکارم کی بڑی صاحبزادی حضرت شاہ سکندر کے عقد نکاح میں آئی۔ کچھ عرصہ بعد ان کی وفات ہو گئی۔ تو پھر دوسری صاحبزادی حبالہ عقد میں آئی۔ اولین زوجہ محترمہ کا نام زینب خاتون اور زوجہ دوم کا نام دولت خاتون تھا۔

بعد میں ایک اور نکاح آپ نے کیتھل کے ترمذی خاندان میں کیا۔ اس خاندان میں آپ کی ننھیال بھی تھی۔ ان کا نام بی بی عالم خاتون تھا۔

اولاد:- زوجہ اول سے کوئی اولاد نہ تھی۔ زوجہ دوم سے دو صاحبزادے تولد ہوئے۔ اول سید شاہ گدائے رحمان عباس دوم سید شاہ محب اللہ الیاس زبدی۔ زوجہ سوم سے ایک صاحبزادی تولد ہوئی جن کا نام بی بی رابعہ تھا۔

حضرت شاہ کمالؒ کے بعد:- جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ حضرت شاہ سکندرؒ اپنے جد محترم ہی کی زندگی میں اس بار عظیم کو اٹھانے کے قابل ہو چکے تھے۔ جو آپ کے دوش مبارک کے لئے قدرت نے منتخب کیا تھا چنانچہ ۹۸۱ھ میں بتاریخ ۲۹ جمادی الاخر جب اعلحضرت نے اس تیرہ خاکدان سے عالم بقا کی جانب کوچ کیا۔ تو ان مجالس و محافل میں مطلقاً کوئی خلل نہ پڑا۔ جو زمانہ کے لئے منبع نور اور روشنی کا مینار تھیں۔ آپ نے جس اسلوب و نہج پر حضرت شاہ سکندرؒ کی تعلیم و تربیت فرمائی تھی۔ اور اس جوہر قابل نے جو بلند نظری اور فکر عمیق آپ کی صحبت اور تربیت سے حاصل کیا تھا۔ اس کی وجہ سے کسی قسم کا خلل رونما نہ ہوا۔ ہر چند کہ اعلحضرت جیسے یگانہ روزگار بزرگ کی رحلت وابستگان در دولت کے لئے ایک صدمہ عظیم سے کم نہ تھی۔ غروب آفتاب سے ایک مرتبہ تو ہر سمت تاریکی چھا جاتی ہے۔ لیکن اگر بدر منیر جلوہ فشانی کے لئے موجود ہو تو غروب آفتاب کے وقت کی تاریکی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اعلحضرت کی وفات اور جدائی کا صدمہ اگر متعلقین اور معتقدین کے لئے وجہ اضطراب اور باعث خلش تھا۔ تو ایک اطمینان کی صورت بھی موجود تھی۔ کہ حضرت شاہ سکندرؒ کا وجود زخم خوردہ دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتا تھا۔ وہ محافل و مجالس جن کی بنیاد حضرت اقدسؒ نے کیتھل کے ایک مختصر سے حجرہ میں رکھی تھی۔ اور جس کے حاضرین آنے والے تمام حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتے تھے۔ جہاں قرآن مجید کے اسرار و رموز و غوامض بیان کیے جاتے۔ اور سیرۃ النبیؐ کے وہ پہلو نمایاں کیے جاتے کہ جن

کے بل پر زمانہ کو تبدیل کیا جاتا۔ اور تاریخ کے دھارے کو موڑا جاتا ہے۔ فقط تسبیح و مصلی نے کبھی قوموں کی تقدیر نہیں بدلی۔ وہی نعرہ مستانہ یہاں کام دیتا ہے۔ جو میدان کربلا میں گونجا۔ اور جس نعرہ نے مامون کے دربار کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ حضرت شاہ سکندر روسؒ کے وجود مسعود نے اس مجلس کو اور زیادہ رونق عطا کر دی۔ اور فیوض و برکات کا وہ دریا جو بہہ رہا تھا اس کی روانی میں مطلقاً کوئی فرق نہ آیا۔ زبدۃ المقامات میں سے ایک بیان درج کیا جاتا ہے:-

"آپ کے بعد یعنی اعلیٰحضرتؒ کے بعد حضرت شاہ سکندرؒ آپ کے مواریث احوال و مواجید خوارق عادات کے وارث ہوئے۔ مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ آفتاب کی طرف نظر جما سکتے ہیں۔ لیکن حضرت شاہ سکندرؒ کے دل پر غلبہ نور کی وجہ سے نظر نہیں ٹھہر سکتی"۔

اعلیٰحضرت کا مقصد اس جمود کو توڑنا اور اس سکون کو مائل بہ حرکت کرنا تھا۔ جو دیر سے ہندوستان کی اسلامی زندگی پر طاری تھا۔ سلسلہ چشتیہ کہ جس نے سب سے پہلے اس سرزمین میں اسلام کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی زمانہ میں شرع اسلامی سے بہت قریب تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اسی مناسبت سے ہندوستانی عقائد کے اثرات اس سلسلہ میں سرایت کرتے چلے گئے۔ اسلامی شریعت کا بنیادی عقیدہ جماعتی نظم و تنظیم اور اس کے بعد انسان کی انفرادی زندگی کو عمل کی قوتوں سے بہرہ ور کرنا ہے۔ اسلام ایک فرد کی تعمیر اس انداز میں کرتا ہے۔ کہ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنی ان قوتوں سے کام لینے کی اہلیت پیدا کر لیتا ہے۔ کہ جو قدرت نے اسے ودیعت فرمائی ہیں۔ مسلمان کی زندگی اسلامی نظم کے زیر اثر سراسر حرکت و عمل ہے۔ اس میں سکون و سکوت اور گیان دھیان کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں۔ اسلامی عبادات اور شرعی نظام کے زیر اثر انسان جہاد زندگانی کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس کی زندگی کا کوئی لمحہ ساکن نہیں رہ سکتا۔ بر خلاف اس کے دیگر مذاہب عالم اور بالخصوص ہندو مذہب کا بنیادی عقیدہ سکون کی تمنا اور سکوت کی تلاش ہے۔ وہاں جماعتی نظم کے نام کی کوئی چیز نہیں۔ خانقاہوں کے نام سے جو روحانی تربیت گاہیں اس وقت ہندوستان میں موجود تھیں۔ ان کا طریق کار بھی مذکورہ طریق کار سے مناسبت

رکھتا تھا۔ کہ وہاں افراد کی روحانی تربیت پر توجہ کی جاتی تھی۔ اس طریق کار میں بھی بلاشبہ افادیت کا ایک پہلو مضمر ہے۔ لیکن دین اسلامی کا مقصد اس سے کہیں بلند ہے۔ انفرادی تربیت اسی وقت مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جبکہ اسے جماعتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے بصورت دیگر وہ بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس زمانہ میں نیک خدارسیدہ اور روحانی طاقتوں سے مالامال بزرگوں کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن وہ اور ان کے پیروکاروں میں وہ ولولہ اور جوش مفقود تھا۔ جو زمانہ کے بگڑے ہوئے مزاج کو درست کر سکتا ہے۔ زمانہ شناسی اور وقت کی نبض کی پہچان کے لئے بڑی گہری بصیرت اور بلند نظری کی حاجت ہے۔ اور زمانہ سے ٹکر لینا۔ اور اس کا رخ موڑ دینا تو بڑی ہی جاں کاوی اور جانبازی طلب کرتا ہے۔ فقط خانقاہوں میں بیٹھنے، مسند شیخیت آراستہ کرنے اور محض حوحق کے نعرے بلند کرنے سے تاریخ کے دھارے نہیں بدلتے۔ اور بدقسمتی سے وہ دور جو ہمارے مدنظر ہے۔ اس پر کہیں بھی نظر ڈال لیجئے۔ روحانیت کی تعبیر، تصوف۔ درویشی اور بزرگی کی یہی تفسیر کی جاتی ہے۔ کہ بس دنیا سے الگ تھلگ معاملات دنیا سے لاتعلق اور بے غرض تسبیح گھمانا ہی نیکی اور دینداری ہے۔ مگر کیا کبھی اس سکوت وسکون کی فضا انقلاب بپا کر سکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! انقلابی کیفیات اسی تعلیم مکتب و مدرسہ کی پیداوار نہیں۔ یہ ان مجالس سے حاصل ہوتی ہے۔ کہ جن مجالس کا صدر نشیں حضرت شاہ سکندر روس جیسا بلند نظر بزرگ ہو۔ اور جس کی نگاہ دوررس زمانہ کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ اور دین کے تمام کوائف سے بوجوہ احسن شناسا ہو۔

آسماں بار امانت نہ توانست کشید قرعہ فال بنام دیوانہ زدند

یہ حقیقت کسی طرح چھپائی نہیں جا سکتی۔ کہ جلال الدین اکبر بادشاہ کا وہ دور کہ جس میں دین اسلام انتہا درجہ کسمپرسی کے عالم میں تھا۔ اور اس دین کے پیروکار نشانہ تضحیک بنتے تھے اور پھر بعد میں نور الدین جہانگیر کا زمانہ جس میں اگرچہ دین الٰہی اکبرشاہی کا رنگ تو پھیکا پڑ چکا تھا۔ لیکن تشیع نے دربار جہانگیری کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ حتیٰ کہ جہانگیر نے اپنی سلطنت کا قاضی

القضاۃ ہی اس شخص کو مقرر کیا تھا جو شیعہ تھا۔ ناممکن تھا کہ ان دونوں حکمرانوں کے متضاد خیالات واعمال سے رعایا متاثر نہ ہوتی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ کہ اگر اکبر کے زمانہ میں اسلامی اعمال وافعال پر ہندوانہ خیالات اور دین الٰہی اکبر شاہی کا گرز ضرب لگا رہا تھا۔ تو جہانگیر کے دور میں تشیع نے اہل دین کا گلہ گھونٹ رکھا تھا۔ اکبر بادشاہ کے عروج کے زمانہ میں اس کے افکار وخیالات کے خلاف ایک ہلکا سا طوفان مشرق سے اٹھا۔ کہ جس نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ اس بغاوت کے راہنما چند نیک طینت علمائے کرام تھے۔ لیکن بادشاہ کی استبدادی سیاست نے چند ہی دنوں میں اس بغاوت کو فرو کر دیا۔ اور اس بغاوت کی رہنمائی کرنے والوں کو عدم کا راستہ دکھا دیا گیا۔ عبدالحکیم مرزا کا حملہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ جس کا نتیجہ علمائے حق کی مرضی کے مطابق نہ نکلا۔ اور یہ تمام طوفان جو حکومت وقت کے خلاف اٹھا تھا۔ بلبلہ کی طرح بیٹھ گیا۔ اکبر بادشاہ کو مجتہدانہ اختیارات دینے کے لئے جو محضر نامہ علماء نے ۹۸۷ھ میں تحریر کیا تھا۔ اس کے بل پر بادشاہ نے اپنی وفات کے وقت تک یعنی ۱۰۱۴ھ تک پورے ستائیس سال دین اسلام کی بیخ کنی اور بے حرمتی میں صرف کیے۔ اور اس کی ان حرکات کے خلاف آواز اٹھانے والوں کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ وہ ایسا عبرتناک تھا۔ کہ تمام ہندوستان میں سناٹا چھا گیا۔ اور کسی گوشہ سے ایسی آواز نہ اٹھی۔ جو اس دور پر آشوب وپر فتن کو للکار سکتی۔ اکبر بادشاہ کا یہ دورِ استبداد پورے ستائیس سال قائم رہا۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے تخت سلطنت پر قدم رکھا۔ جس کا مزاج دین الٰہی اکبر شاہی، سے تو کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ لیکن یہ بادشاہ اتنا ہوشمند بھی نہ تھا۔ کہ اکبر نے جو لادینیت کا بیج ہندوستان میں بویا تھا۔ اس کے اثرات وثمرات کو مٹا سکتا۔ برخلاف اس کے اپنی ملکہ نورجہاں کے زیر اثر نادانستہ طور سے تشیع کی ترویج واستحکام میں معاون رہا۔ جہانگیر نے کم وبیش تیئس سال تک داد حکمرانی دی۔ ان دونوں بادشاہوں کا دور حکومت اس لحاظ سے پورے تہتر سال تک رہا۔

لیکن اگر ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کریں۔ اور ان حالات وواقعات پر گہری نظر ڈالیں تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ جہانگیر کی حکومت کے آخری دس سال قطعی مختلف نظر آتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ

میں جو اس کا انداز حکومت تھا۔ آخر میں وہ سراسر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے قول کے مطابق یہ تبدیلی جو جہانگیر کے آخری عہد میں پیدا ہوئی اور اتنی دور رس ثابت ہوئی کہ عالمگیر کے دور میں اپنے کمال کو پہنچ گئی۔

خاکسار مصنف عرض گزار ہے کہ جہانگیر کے آخری ایام حکومت میں جو انقلاب راعی اور رعایا کے خیالات میں پیدا ہوا اس کے نمایاں اثرات شاہجہاں کے عہد حکومت میں نظر آتے ہیں۔ اور عالمگیر اورنگ زیب کی حکومت نے تو وہ عہد یاد دلا دیا۔ جو تاریخ اسلام کا سرمایہ امتیاز اور ہر اہل نظر کے لئے سرمہ بصیرت کا حکم رکھتا ہے۔ یہ اچانک انقلاب جو جہانگیر کے زمانہ میں پیدا ہوا۔ اس کے بارہ میں یہ تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ تمام تر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی ذات بابرکات کی بدولت تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ یہ انقلاب کسی فوری اقدام کے ذریعہ سے عمل میں آگیا تھا۔ قطعی غلط ہے۔ جو چیز میرے ذہن کو تہہ و بالا کیے دے رہی ہے۔ اور جو خیالات میری روح کے اندر متلاطم ہیں۔ شاید وہ اس وقت بالکل نئے معلوم ہوں۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو میں آئندہ چل کر بیان کرنے والا ہوں۔

حضرت امام ربانی کی عمر جس وقت حضرت شاہ کمالؒ رہگذائے عالم بالا ہوتے ہیں۔ صرف گیارہ سال تھی۔ لیکن خود حضرت امام ربانی کے قول کے مطابق انہیں وہ تمام باتیں یاد تھیں جو اعلحضرت کی زبان فیض ترجمان سے نکلا کرتی تھیں۔ اور حضرت کا حلیہ مبارک تک اور وہ نشستگاہ بھی پوری طرح یاد تھی جہاں حضرت اقدس قیام فرما تھے۔ اس شہادت کے بعد یہ قطعی طور سے طے شدہ ہے کہ بدورِ شعور ہی سے اعلحضرت سے انہیں لگاؤ تھا۔ اور جناب شیخ (اعلحضرت) کو بھی عبدالاحد صاحب کی تمام اولاد میں یہی ایک جوہر قابل نظر آیا۔ کہ جس کی تربیت اپنے اور اپنے جانشین کے لئے مخصوص کر دی۔ اعلحضرت کا وصال ۹۸۱ھ میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے ان کی تمام تر تربیت حضرت شاہ سکندر رحؒ کے ذمہ ہو جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اور شاید کوئی بھی سوائے قیاس آرائیوں کے کوئی بات نہ بتا سکے۔ کہ تذکرہ نگاروں نے حضرت شاہ سکندرؒ حضرت شاہ کمالؒ

کے حالات سے غفلت کیوں برتی ۔ شیخ عبدالحق دہلوی کی تصنیف " اخبار الاخیار " اس زمانہ کی قابل قدر تصنیف ہے۔ اور جب آپ نے اپنی تصنیف جہانگیر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی تو جہانگیر نے ان الفاظ میں اس تصنیف کی داد دی۔ " خیلے محنت کشیدہ است "

جناب شیخ عبدالحق دہلوی نے اخبار الاخیار ۱۰۲۸ھ میں بادشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کی۔ اور یہی سال حضرت امام ربانی کے بادشاہ سے تعلقات کشیدہ ہونے اور آپکی اسیری کا ہے۔ بادشاہ سے " خیلے محنت کشیدہ است " کی داد لینے والا خود حضرت امام ربانی سے کبیدہ خاطر تھا۔ اور یہ کبیدہ گئی خاطر مختلف وجوہات کی بنا پر تھی۔ ایک تو حضرت مجددؒ کا دربار جہانگیری میں معتوب ہونا۔ اور کچھ ان مکتوبات کے مضامین کے سبب کہ جن کی بنا پر جہانگیر کو آپ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع ملا۔ ایسے حالات میں شیخ عبدالحق دہلوی کیا۔ شاید کسی بھی مصنف کو جرات نہ ہوتی۔ کہ امام ربانی کے حالات لکھتا۔ امام ربانیؒ کے حالات زندگی کا اس دور کی تصنیف میں آنا تو قطعی قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حضرت شاہ سکندرؒ اور اعلحضرت کی حیات طیبہ اور ان کے حالات کے لکھنے سے اعراض کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ حکومت وقت کی نگاہ میں یہ لوگ پسندیدہ نہ تھے۔ حضرت مجدد کی تمامتر مساعی جو انہوں نے حالات کے سنوارنے اور اس بگاڑ کے بنانے میں کی جو اکبر کی لادینیت اور جہانگیر کی عیش کوشی کے سبب سلطنت میں رونما ہو گئے تھے۔ حضرت شاہ سکندرؒ کی تربیت کی مرہون منت تھیں۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ یہ حضرت شاہ سکندرؒ کی نگاہ کیمیا اثر کا فیض تھا۔ کہ حضرت امام ربانی نے اس وقت کی " دیندار " دنیا میں ہیجان برپا کر دیا۔ حضرت شاہ سکندرؒ کے دیگر کارناموں سے قطع نظر اگر ہم ان کے اسی ایک زمانہ کو مد نظر رکھیں۔ تو وہ ولایت وہدایت کی دنیا کے نیر تاباں نظر آتے ہیں۔ اگر کسی تذکرہ نگار نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اور حضرت مجدد کی مساعی کا منبع اس چشمہ فیض کو نہیں قرار دیا۔ جو کیتھل میں رواں دواں تھا۔ تو اس سے ان کی عظمت میں کوئی خلل نہیں پڑ سکتا۔ حقیقت پر چاہے کتنے ہی پردے ڈالے جائیں۔ لیکن اس کی روشنی و تابانی چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ حضرت امام ربانی بلاشبہ ایک بدر کامل تھے۔ لیکن اس بدر کامل کی تمام رعنائی و

تابانی آفتاب ولایت حضرت شاہ سکندرؒ کی مرہونِ منت تھی ۔ یہاں ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ٹھوس حقائق پیش کرتے ہیں ۔

یہ تو تمام معاصرانہ تصانیف میں مرقوم ہے ۔ جس میں سب سے زیادہ معتبر تذکرہ " زبدۃ المقامات " ہے کہ حضرت امام ربانی کی پیدائش سے قبل حضرت شاہ کمالؒ نے آپ کی ولادت کی بشارت دی تھی ۔ اور بشارت بھی کامل و مکمل تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ اس صاحب کمال کی نگاہوں کے سامنے آنے والے زمانہ کے تمام حالات روشن تھے ۔ اور امام ربانی کے والد محترم شیخ عبد الاحد کو بھی اس بارہ میں اتنا اہتمام تھا ۔ کہ اگر عالم طفولیت میں یہ بیمار ہوتے ہیں ۔ تب بھی دعا کے لئے صحت کے لئے حضرت اقدس کی خدمت میں لے کر آتے ہیں ۔ خود غلبہ ذوق و شوق کے زیر اثر جناب مرشد کے پاس کیتھل حاضر ہوتے ہیں ۔ تو انہیں ساتھ لاتے ہیں ۔ صاف نظر آتا ہے کہ شیخ عبد الاحد کو یہ مطلوب تھا ۔ کہ نہال بستان ہدایت جسے اعلیٰحضرت کے زبردست ہاتھ نے نصب کیا تھا ۔ اس کی ہر پتی اور شاخ انہیں کے دست مبارک کی تراش و خراش سے زینت افزائے عالم ہو ۔ حضرت امام ربانی گیارہ سال کے تھے ۔ جب اعلیٰحضرت کا وصال ہوا ۔ لیکن چونکہ ذہین و فطین تھے ۔ اس لئے ان اثرات کو پوری طرح قبول کر چکے تھے ۔ جو اعلیٰحضرت کی مجلس پر نور میں حاضری اور آنحضور کی توجہ کا لازمی نتیجہ تھے ۔

اور پھر یہ ہلال افق ولایت اس ہستی اعلیٰ کی نگاہ روشن کا مرکز بنتا ہے ۔ کہ جس کے بارہ میں خود مجدد صاحب کی روایت ہے ۔ کہ " حضرت شاہ سکندرؒ کا قلب سورج سے بھی زیادہ روشن ہے ۔ بلکہ سورج کی طرف تو دیکھا جا سکتا ہے ۔ لیکن آپ کے قلب مبارک پر نگاہ ڈالنا ممکن نہیں " حضرت امام ربانی جیسا جوہر قابل اب اس مرشد کامل کی تربیت میں آتا ہے ۔ کہ اس کی ہدایت کی روشنی نے سلسلہ قادریہ کو روشن کر رکھا ۔ ۹۸۱ھ سے ۱۰۰۸ھ تک پورے ستائیس سال تک حضرت امام ربانی نے اس چشمہ فیض سے اکتساب کیا ہے ۔ کہ جس کی روشنی نورانیت ، رعنائی وصف اور حسن و کمال کے وہ معترف تھے ۔ جب تربیت کے تمام مراحل طے ہو چکے ہیں ۔ اس وقت انہیں اجازت ملتی

ہے۔ کہ وہ سلسلہ نقشبندیہ سے بھی اکتساب کریں۔ چنانچہ ۱۰۰۸ھ میں وہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے بیعت کرتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ کہ جب حضرت مجدد صاحب حضرت خواجہ باقی باللہ کی مجلس بابرکت میں قدم رکھتے ہیں تو ان کا اشتیاق ان سے بھی زیادہ فزوں تھا۔ اور مرشد کی بے قراری مرید سے بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ کو دیکھتے ہی حضرت خواجہ صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلا آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

خدارا! غور فرمایئے! کہ وہ مرد کامل جس کے انتظار میں حضرت خواجہ بے قرار تھے۔ اس نے یہ کمال کی منزلیں کہاں طے کی تھیں؟ اس کا منطقی جواب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے کمالات کیتھل کی اس مجلس کے مرہون منت ہیں۔ جو حضرت شاہ سکندرؒ کے دم سے روشن تھی۔ بلا شبہ حضرت امام ربانی پر آخر میں نسبت نقشبندیہ کا غلبہ واستیلاء تھا۔ جس کا اظہار آپ نے اپنے مکتوبات میں بار بار کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ بدستور قائم رہتی ہے۔ کہ عہد طفولیت سے لے کر ابتدائے کہولت تک آپ کی مکمل تربیت کیتھل ہی میں ہوئی تھی۔ اگر ذوق و تجسس کی آنکھیں کھول کر دیکھا جائے۔ تو اور بھی بہت سے اسرار نمایاں ہوں گے۔ اس امر پر تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے۔ کہ حضرت امام ربانی سولہ سترہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ گویا ۹۸۷ھ تک آپکی مکتبی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اسی سن میں حضرت شاہ سکندرؒ آپ کو سلسلہ قادریہ میں داخل فرماتے ہیں۔ اور یہ وہی سال ہے کہ جہاں سے اکبر بادشاہ کی لادینیت اور بے راہ روی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ملا مبارک ناگوری اور اس کے دونوں فرزند اسی سن میں وہ محضر اجتہاد تیار کرتے ہیں اور اس پر تمام علماء سے دستخط کراتے ہیں۔ کہ جس کی رُو سے اکبر بادشاہ کو تمام شرعی اور دینی امور پر دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کی گردن اس حلقہ اطاعت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ جو علماء کی عقیدت نے اس کے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ گویا جس مقام سے ہندوستان کی شرعی زندگی پر حملہ ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت سے حضرت شاہ سکندرؒ اس کے انسداد کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ گویا آپ کے ضمیر روشن پر آنے والے واقعات کا پرتو پڑ رہا تھا۔ اور وہ فتنہ

اور اس کے نتائج پوری طرح آپ پر واضح تھے۔ جس نے پورے چالیس سال تک ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ تعمیری قدم کسی فوری جوش کے تحت نہیں اٹھائے جا سکتے۔ اس کے لئے بے امتیازی کی اور دانائی اور سکون و توانائی کی حاجت ہے۔

حضرت شاہ سکندرؒ ہی کے زمانہ میں وہ المناک واقعات ہوئے۔ کہ جنہوں نے ہندوستان بھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ حق کو علماء جو اکبر کی بے دینی پر تڑپ اٹھے تھے اور پھر نتائج کی پروا کئے بغیر میدان وغا میں کود پڑے تھے۔ ان کی اس جسارت کا نتیجہ جیسا کہ ظاہر ہے کچھ بھی نہ نکلا۔ وہ آواز حق اٹھا لیکن دبا دیا گیا اور اس کے بعد ایسا سناٹا چھایا۔ کہ کہیں سے صدائے "لا الٰہ" نہ سنائی دیتی تھی۔ لیکن جس احتیاط و توجہ سے کیتھل کے اس مکتبہ فکر میں حریت فکر، ژرف نگاہی، بلند نظری اور آزادی رائے کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ اس کا تقاضا تھا۔ کہ یہاں کے تربیت یافتہ ایک عرصہ کے بعد ہندوستان کے علمی، سیاسی اور دینی افق پر یوں چھا جائیں۔ کہ ان کے سامنے ہر مخالفانہ صدا بے اثر ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ وقت نے ثابت کر دیا۔ کہ کیتھل کے ایک مختصر سے قصبہ میں قیام کرنے والا مرد درویش جو چراغ جلا چکا تھا۔ اس کی لَو نے پورے ہندوستان کو کس طرح منور کر دیا۔

جہانگیر کے آخری ایام حکومت میں سراسر پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ وہ شاہی دربار جہاں بدعات، بددینی اور بے راہروی کا دور دورہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دینداری کا مرکز بن جاتا ہے۔ وہ شاہی امراء جن کی زندگی کا مدعا بادشاہ کو خوش کرنے اور اپنے لئے جاہ و مناصب حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسی دینداری کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ کہ بڑے بڑے زہاد و صالحین کو ان کی پاکیزہ زندگی پر رشک آنے لگتا تھا۔ موقع شناس علماء کہ جن کی زبانیں حکومت کے استبداد نے گنگ کر دی تھیں۔ یکایک اپنے مدارس و مکاتب میں زندگی کی حرارت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ صوفیائے کرام جنہوں نے شریعت اور دین کو اپنے افکار و خیالات کی بازی گاہ بنا لیا تھا۔ یکایک منہاج شریعت کے محافظ بن جاتے ہیں۔ جہانگیر کے بعد شاہجہان کا دور آتا ہے۔ ذرا اس زمانہ کے مصوروں کی بنائی ہوئی قلمی تصویروں پر نظر ڈالیے۔ اکبر بادشاہ کی تصویر کیا ہے۔ کسی راجپوت راجہ

کی صورت کا چربہ ہے ۔ وہ کھڑکی دار پگڑی ۔ بڑی بڑی مونچھیں ۔ داڑھی صفاچٹ ۔ یہی کیفیت جہانگیر کی ہے ۔ لیکن شاہجہاں کی شبیہ کو دیکھیے ۔ فکر کی آنکھوں میں نور اتر آتا ہے ۔ وقت بدل گیا ہے تو ہر چیز بدل گئی ہے ۔ قطعی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیندار پابند شریعت حکمران ہے ۔ جو ہندوستان کے تخت پر جلوہ فرما ہے ۔ اور پھر اورنگ زیب عالمگیر کے تو کہنے ہی کیا ہیں ۔ وہ تو ہے ہی

ترکش مارا فدنگ آخریں

انقلاب اور ایسا دور رس انقلاب کسی فوری جوش کے نتیجہ میں حاصل نہیں ہو سکتا کہ جو یوں شاہ و گدا ۔ فقیر و امیر کو سراسر بدل کر رکھ دے اور پھر یہ انقلابی کیفیت فقط اورنگ زیب عالمگیر پر ہی ختم نہیں ہو جاتی ۔ خاندان ولی اللہی اور اس کی سرفروشیاں سید احمد شہید کی میدان وغا میں جاں بازیاں ان سب کی بنیاد ۹۸۷ھ میں اس مختصر سے حجرہ میں رکھی جا چکی تھی ۔ جہاں حضرت شاہ سکندر روس ؒ نے امام ربانی کو کہ ابھی صرف میاں شیخ احمد اور نوجوان سالک منزل سلوک تھے سلسلہ قادریہ میں بیعت کیا تھا ۔ علماء کا وہ گروہ کہ جن کی بے غرضانہ دینی خدمات ، اخلاص ، آزادی فکر اور ایثار و تدبر کی بدولت سرزمین ہندوستان پاکستان میں دین اسلام کا نور و ظہور اپنے صحیح رنگ میں نظر آتا ہے ۔ اور جن کے نفوس قدسی کی بدولت منہاج نبوت زندہ و پائندہ ہے ۔ یہ سب اسی سلسلۃ الذہب میں منسلک ہیں ۔ اور اسی مالا کے مروارید کے دانے ہیں ۔ تاریخ کی ستم ظریفی بعض اوقات بڑے گل کھلاتی ہے ۔ آج ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں ۔ کہ حضرت شاہ سکندر روس ؒ کی اس مجلس میں جہاں بیٹھ کر میاں شیخ احمد سرہندی نے مجدد الف ثانی بننے کی اہلیت حاصل کی اور ہندوستان کی شرعی و دینی امامت کا تاج اپنے سر پر رکھا ۔ اور کون کون خوش نصیب و خوش بخت تھے ۔ جو ان کے ساتھ اس مجلس کے خوشہ چیں تھے ۔ میرے خاندانی ملفوظات اور قلمی تذکرے اس بارہ میں قطعی خاموش ہیں ۔ اب یہ تو کسی طرح ممکن نہیں ۔ کہ حضرت شاہ سکندر ؒ کے حلقہ فکر و ذکر میں فقط

ایک شیخ احمد سرہندی تھے۔ اور کوئی نہ تھا۔ خدا جانے کتنی بڑی تعداد نے اس کان گہر سے اپنے فکر کے دامن کو مکلل بہ جواہر کیا ہو گا۔ لیکن جو شہرت و ناموری حضرت امام ربانی کے حصہ میں آئی۔ اس کی تابانی نے ہر معاصر و ہم زمانہ کو پس پشت ڈال دیا۔ اور یوں بھی زمانہ کا قاعدہ ہے کہ اسی سر پر تاج قیادت رکھتا ہے۔ جو اس کے قابل ہوتا ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

سترہ سال کی عمر میں سلسلہ قادریہ میں بیعت ہونے والا اور حضرت شاہ کمالؒ اور حضرت شاہ سکندرؒ کی نگاہ انتخاب میں منتخب ہونے والا یہ نوجوان جیسا کہ آگے چل کر ثابت ہوا۔ عظیم استعداد کا مالک تھا۔ داد و تحسین کے قابل ہیں وہ نگاہیں۔ کہ جنہوں نے اس جوہر قابل کو چھانٹنے بنانے اور سنوارنے مین عرق ریزی سے کام لیا۔ ہندوستان میں جس وقت لادینیت کا زور تھا اور شریعت اسلام اور شعائر اسلامی کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ گویا شیطانیت کا ایک طوفان تھا۔ جو گھنگور گھٹا کی طرح سے ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ اس وقت کیا آپ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ حضرت شاہ سکندر روسؒ کی مجلس میں فقط ذکر و فکر کی تعلیم کا چرچہ رہتا تھا؟ وہ مکتبہ فکر جس میں سالہا سال تک امام ربانی جیسے بلند پایہ مجاہد نے تربیت حاصل کی ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ وہاں زمانہ کے حالات سے قطع نظر فقط سکوت و سکون اور گیان دھیان سے کام لیا جاتا ہو۔ افسوس کہ آج ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں۔ کہ اس مجلس درس کی من و عن کیفیت جس کے ذریعہ کھینچی جا سکے۔ اور وہ مکالمے اور گفتگو ئیں سنی جا سکیں جو حضرت شاہ سکندر روسؒ اور حضرت امام ربانی اور دیگر شرکائے مجلس کے درمیان رہتی ہوں گی۔ ہندوستان کو بادشاہ کی بے دینی کا سیلاب بہائے لیے جا رہا تھا۔ اور ہر خشک و تر آتش نمرود میں جل رہا تھا۔ وہ مجلس جہاں اس دور کے ابراہیم کو تیار کیا جا رہا تھا۔ اس کے اضطراب و بے قراری کا نقشہ ہم تخیل کے ذریعے تو محسوس کر سکتے ہیں۔ اور کوئی ذریعے اس کے علاوہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ جرات گفتار و کردار کا وہ جوہر جو امام ربانی کا طرہ امتیاز ہے۔ وہ حضرت شاہ سکندر کی نگاہ فیض کا کرشمہ تھا۔ فیضی و ابوالفضل اور آگرہ و دلی کے عمائدین حکومت سے چند ایک

ملاقاتوں ہی میں حضرت امام ربانی نے اپنے علم و فضل اور نظر و فکر کی عظمت کا سکہ منوالیا تھا۔ چنانچہ آگرہ کے قیام کے دوران ابوالفضل اور فیضی جیسے بلند پایہ اہل علم سے آپ کی صحبتیں رہتی تھیں۔ لیکن ہر محفل اور ہر مجلس میں آپ کا رنگ منفرد اور نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک مرتبہ عید کے چاند پر اختلاف تھا۔ حکومت اور بادشاہ کی طرف سے عید کا اعلان ہو چکا تھا۔ لیکن حضرت امام ربانی صائم تھے۔ فیضی و ابوالفضل تو حکومت وقت کے کار فرما تھے۔ ابوالفضل کو جب معلوم ہوا کہ آپ روزہ سے ہیں۔ تو اس نے روزہ کشائی کے لئے اصرار کیا۔ پانی کا پیالہ اٹھایا اور آپ کے منہ سے لگا دیا۔ آپ نے انکار کر دیا۔ ابوالفضل نے کہا کہ بادشاہ کی طرف سے عید کا اعلان ہو چکا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ "بادشاہ بیدین است اعتبارے ندارد"۔

یہ آگرہ و دلی کے سفر اسی دانائے راز کے اشارے سے ہو رہے تھے۔ کہ جس کا قلب مطہر زمانہ کے حالات پر گریاں و بریاں تھا۔ اور جسے دین اسلام کی بے کسی و کسمپرسی مضطرب کیے دے رہی تھی۔ اور صاف نظر آتا ہے۔ کہ جب اکبری الحاد اپنے عروج پر تھا۔ تو اسی وقت سے اس کے اثرات کو مٹانے کے سامان شروع ہو گئے تھے۔ حضرت شاہ سکندر ہی کی اجازت و علم کے ساتھ امام ربانی نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے یہ سفر اختیار کیے تھے۔ اور پھر انہی کے اشارہ اور ایماء سے اس دور کے دیندار امراء اور علماء سے خط و کتابت شروع کی تھی۔ اس درجہ کے مرید کا مرشد ظاہر ہے کہ کس قدر بالغ نظر اور نگاہ دوررس کا مالک ہو گا۔ وہ بزرگ ہستی کہ جس کا قلب مبارک سورج سے زیادہ روشن تھا۔ وہاں سے امام ربانی کسب نور کر رہے تھے اور زمانہ میں پھیلا رہے تھے۔ ۹۸۷ھ سے ۱۰۰۸ھ تک مکمل طور سے اور اس سے قبل کا کچھ عرصہ حضرت امام ربانی جناب شاہ سکندر کی زیر تربیت رہے۔ اور جب سلسلہ قادریہ کے تمام فیوض و برکات سے بہرہ ور ہو چکے۔ تب ۱۰۰۸ھ میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی۔ اور اس عرصہ میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے مقام تک رسائی بھی پا رہے تھے۔ اور اپنی تبلیغی کوششوں میں بھی مصروف تھے۔ آپ کی شہرت و عروج اگرچہ واقعہ اسارت کے بعد اپنے اوج کمال پر پہنچی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ سکندر کی تربیت کے طفیل آپ میں جو ایک گہری بصیرت اور بلند نظری پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے آپ کے دل کو ابتدا ہی سے بے چین و مضطرب کر رکھا تھا۔ اور واقعہ اسارت سے۔ بہت پہلے آپ نے اپنی سعی و کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔ بلاشبہ یہ حضرت امام ربانی کا بڑا کمال ہے کہ اس وقت جبکہ ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دیندار حلقے اپنی آخری تڑپ کا تماشہ دکھا کر خاموش ہو چکے تھے۔

اکبر بادشاہ اور اس کے حواریوں کو اپنی خلافِ اسلامی سرگرمیوں کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آ گیا تھا۔ اور کچھ اس طرح کی کیفیت ہر سمت طاری تھی۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آتے صدا لاالٰہ الاّ اللہ

علمائے حق کی زبانوں پر بادشاہ کے استبداد نے موت کی مہر لگا دی تھی۔ حلقہ صوفیاء اپنی گدیاں بچانے اور محض ھوحق کی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں تھے۔ اس وقت ایک اندرونی لہر چلتی ہے۔ اور تمام ہندوستان میں ہر دیندار قلب کو بے چین کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ امام ربانی کا کمال ہے کہ وہ اس عالم میں زمانہ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ اور حالات سے متاثر و مرعوب ہو کر خاموش نہیں ہو جاتے۔ بلکہ نہایت مہارت سے ان لوگوں کو تلاش کر لیتے ہیں کہ جو ان حالات سے غیر مطمئن اور مضطرب تھے۔ حضرت امام ربانی نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز و محور بالخصوص اس حلقہ کو بنایا۔ جس کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار کی باگ ڈور تھی۔ اور یہ آپ کا کمال تھا۔ کہ آپ کی نگاہ نے اپنے مخاطب کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کی حلقہ امراء و صاحب اقتدار لوگوں کے دلوں کو دین کی حرارت سے گرمانے کا آپ نے جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے نتائج آئندہ چل کر نہایت شاندار نکلے۔ آپ نے اپنے مکتوبات کا سلسلہ ۱۰۰۸ھ سے۔ بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ اور یہ وہی زمانہ تھا۔ جبکہ آپ ابھی تک کیتھل کے دربار قادریہ سے منسلک تھے۔ کیا کبھی یہ بات حلقہ خیال میں آ سکتی ہے کہ آپ جو خطوط کہ جن کی ہر سطر میں دین کی حرارت اور ایمان کی حلاوت ہے لکھتے تھے۔ ان کے مضامین اور مندرجات میں حضرت شاہ سکندر روٗس کا مشورہ

اور رائے اور حسن تربیت کا اثر شامل نہ ہوتا تھا۔ آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ کیتھل کی تربیت گاہ میں گذارا تھا۔ اور کیسے ممکن ہے کہ آپ کے افکار و خیالات اور سرگرمیوں پر حضرت شاہ سکندر کی نظر اثر انداز نہ ہوتی ہو۔

تجدید دین کی یہ مہم جس کا آغاز امام ربانی کے زمانہ شباب سے ہو چکا تھا۔ یہ اسی بلند پرواز شہباز ولایت کی تربیت و تعلیم کی مرہون منت تھی۔ حضرت امام ربانی کی عمر بھر کی سرگرمیاں ان کے مکتوبات اور ان کے مندرجات اور وہ کیفیات جو آپ پر ہر وقت طاری رہتی تھیں۔ اگر ان کا احاطہ کیا جائے تو انسان با آسانی ان کے ذریعہ حضرت شاہ سکندر کی روحانی عظمت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ دین کی وہ حرارت اور وہ سوز دروں کہ جس نے آخر باطل کے خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ وہ اس چشمہ نور سے انہیں حاصل ہوتی تھیں۔ وہ کتنا وسیع الظرف اور کتنا عظیم تھا حضرت شاہ سکندر کا دل۔ کہ جس کی ایک ادنیٰ سی تڑپ نے میاں شیخ احمد سرہندی کو مجددیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

سلسلہ۔ قادریہ کے محیط بیکراں سے سیر ہونے کے بعد حضرت امام ربانی نے حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت کی تھی۔ لیکن اس بیعت کے بعد یہ نہیں ہوا۔ کہ کیتھل کی آمد و رفت بند ہو گئی ہو۔ یا۔ یہاں سے تعلقات منقطع ہو گئے ہوں۔

مختلف قلمی تذکروں میں منقول ہے کہ آپ اکثر کیتھل آتے اور حضرت شاہ سکندر کے آستانہ عالیہ پر قیام کرتے تھے۔ بعض اوقات آپ کے ہمراہ اہل و عیال بھی ہوا کرتے تھے۔ حاضر و غائب چاہے وہ کیتھل کا قیام ہو۔ یا کسی اور جگہ مقیم ہوں۔ اپنے مرشد والا تبار کا انتہا درجہ ادب ملحوظ رکھتے تھے۔ بلکہ جس چیز سے حضرت شاہ سکندر کو ادنیٰ سا تعلق خاطر بھی ہوتا تھا تو اس کا بھی احترام بدرجہ۔ کمال کیا کرتے تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادہ محمد یحییٰ نامی تھے۔ ان پر حضرت شاہ سکندر خاص توجہ فرمایا کرتے تھے۔ اور نظر عنایت رکھتے تھے۔ اور اپنے خاندانی لقب کے مطابق انہیں شاہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ حضرت امام ربانی کے لئے اتنی ہی نسبت کافی تھی۔

وہ ان صاحبزادہ کو خود بھی شاہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اور دوسرے متوسلین کو بھی ہدایت کیا کرتے تھے کہ انہیں شاہ کہہ کر پکارا کریں۔ گویا حضرت شاہ سکندر کی زبان فیض ترجمان سے نکلا ہوا ہر لفظ آپ کے لئے سند کا درجہ رکھتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ حضرت محمد یحییٰ کو آپ شاہ کہہ کر پکارا کرتے بلکہ ان کے ساتھ خصوصی توجہ برتتے تھے۔

نام من رفتہ است روزے برلب جاناں لبہو
اہل دل رابوے جاں می آید از نام ہنوز

اور ایک حد تک ان کا ادب و احترام کیا کرتے۔ اور فرمایا کرتے کہ " ہمارا یہ بیٹا شاہ ہے۔ کیونکہ شاہوں کی گود میں بیٹھا ہے "۔ ان صاحبزادہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے نواسہ تھے۔

سلسلہ۔ نقشبندیہ میں بیعت ہونے کے بعد حضرت امام ربانی پر اسی سلسلہ کا غلبہ زیادہ ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ کیتھل اور زبخت کیتھل یعنی حضرت شاہ سکندر روسؒ سے آپ کے تعلقات میں کوئی رخنہ نہیں پڑا۔ اور آپ متواتر کیتھل میں حاضری دیتے رہے۔ اور یہاں قیام کرتے رہے۔ سرہند سے دلی جاتے ہوتے کیتھل راہ میں پڑتی تھی۔ حضرت امام ربانی کا ظرف اتنا وسیع تھا۔ کہ وہ بیک وقت قادریہ اور نقشبندیہ دونوں مشائخ کرام سے سیراب ہوا کرتے تھے۔ اتنا ضرور ہے کہ آخر میں سلسلہ۔ نقشبندیہ کی طرف آپ کی توجہ زیادہ تھی۔ چونکہ سلسلہ۔ قادریہ کے تمام فیوض و برکات آپ پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔ اور اس محیط بیکراں میں غوطہ زن ہونے کا آپ کو موقعہ بھی زیادہ ملا تھا۔ لیکن سلسلہ۔ قادریہ سے فیض اخذ کرنے میں دریغ نہ کیا کرتے تھے۔ یا یوں کہیے کہ جب کبھی ضرورت پڑتی تھی۔ تو خود حضرت شاہ سکندر روس آپ کے درجات میں اضافہ فرمادیا کرتے تھے۔ قدرت نے حضرت امام ربانی سے جو کام لینا تھا۔ اس کا تقاضہ تھا۔ کہ آپ کی طبیعت کی روانی برقرار رہے۔ اور آپ کے حالات میں تیزی اور براقی پیدا ہوتی چلی جائے۔ اور وہ جوتے سمندو تیز ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رکے۔ کہ جس نے آخر کار

ہندوستان کی کشت ویران کو سر سبز و سیراب کرتا تھا۔ جب بھی کبھی ایسا موقعہ آیا کہ حضرت امام ربانی کی طبع رواں میں رکاوٹ پیدا ہوئی ۔ تو حضرت شاہ سکندر روؒس نے اسے مختلف ذرائع سے رواں کر دیا۔ شاعر نے شاید ایسے ہی موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

حدی را تیز تری خواں چو محمل را گراں بینی
نوارا تلخ تری زن چو ذوق نغمہ کم یابی

صاحب حضرت القدس کا بیان ہے کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی حضرت شاہ سکندر روؒس سے خرقہ مبارک پہن کر بے حد مسرور ہوئے ۔ اور یہ خرقہ مبارک پہننے کے بعد سرہند میں اس روز جنگل اور بیابان اولیاء اللہ سے بھر گئے تھے۔

زبدۃ المقامات کی روایت ہے کہ حضرت امام ربانی کیتھل میں نبیرہ حضرت شاہ کمالؒ و نائب آں ذوالکمال حضرت شاہ سکندر کی خدمت میں یاران طریقت کے حلقہ میں مراقبہ کیے بیٹھے تھے۔ کہ حضرت شاہ سکندرؒ نے آن کر حضرت شاہ کمالؒ کا خرقہ مبارک آپ کے دوش پر ڈال دیا۔ جب آپ نے آنکھ کھولی۔ تو دیکھا کہ حضرت شاہ سکندرؒ سامنے ہیں۔ آپ نے اٹھ کر تعظیم کے ساتھ ان سے معانقہ کیا۔ حضرت شاہ سکندرؒ نے فرمایا! کہ کئی مرتبہ خواب میں میرے جد بزرگوار حضرت شاہ کمالؒ نے فرمایا میرا یہ خرقہ فلاں درویش (شیخ احمد سرہندی) کو پہنچا دو جو تمہاری خدمت میں رہتا ہے۔ ہر چند کہ اسے نکال کر کسی اور کو دینا میرے لئے بہت مشکل بات تھی۔ لیکن جب بتاکید اکید کئی دفعہ میں امور ہوا۔ تو میں نے ناچار امتثال امر کیا۔"

زبدۃ المقامات ایک نہایت ہی معتبر تصنیف ہے۔ اور امام ربانی کے حالات میں شاید اس سے زیادہ قابل اعتبار تصنیف اور کوئی نہ ہو۔ اس کتاب کے محولہ بالا بیان اور خط کشیدہ فقرات سے امنا تو یقینی طور سے ثابت ہے۔ کہ حضرت امام ربانی اکثر و بیشتر کیتھل جاتے رہتے تھے اور وہاں جا کر حضرت شاہ سکندر روؒس کی خدمت اقدس میں رہا کرتے تھے۔ اور آپ کے اوقات کا زیادہ تر حصہ وہاں ذکر و فکر اور مراقبہ میں گذرتا تھا۔ اور اپنی خلقی استعداد، انکسار اور تواضع کے ذریعہ آپ انوار

اکابر نقشبندیہ کا بھی تو ہے اور تیرا ملاک امران بزرگوں کی نسبتیں بھی تھیں۔ اور اب حال واقعہ یہ ہے (یعنی نسبت قادریہ کے سوا سب کچھ سلب ہو گیا)۔ اس خیال کے گزرتے ہی میں نے دیکھا۔ مشائخ نقشبندیہ معہ حضرت خواجہ باقی باللہ تک آئے اور میرے بارے میں مخاصمت کرنے لگے۔ اکابر نقشبندیہ نے فرمایا کہ یہ ہمارا تربیت یافتہ ہے۔ اور ہماری تربیت سے اس ذوق و حال اور کمال و اکمال تک پہنچا ہے۔ آپ کا اس پر کیا حق ہے؟ اکابر قادریہ نے فرمایا۔ کہ ایام طفولیت سے اس پر ہماری نظر و توجہ رہی ہے۔ اور اس نے ہمارے خوان نعمت سے چاشنی چکھی ہے۔ اور ہمارا خرقہ بھی پہنا۔ دونوں سلسلوں کے اکابر اس مباحثہ میں مصروف تھے۔ کہ مشائخ چشت کی ایک جماعت نے آن کر مصالحت کرا دی۔ اس کے بعد سے حظ وافر نصیب کامل دونوں نعمتوں سے میں اپنے باطن میں پاتا ہوں۔"

اس بیان کے اندراج سے یہ دعویٰ پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ تفویض خرقہ کا واقعہ اس وقت پیش آیا ہے۔ جبکہ حضرت امام ربانی سلسلہ۔ نقشبندیہ میں بیعت کر چکے ہیں۔ اور اس سلسلہ کے انوار کا آپ پر غلبہ بھی زیادہ سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اب اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ آپ کے تعلقات اور قلبی وابستگی حضرت شاہ سکندر رؒ سے قائم نہیں رہی ہے۔ اور انہیں ان کے احوال و کیفیات سے آگاہی نہ تھی۔ یہ بدیہی طور سے ثابت ہے کہ ان کے حال پر حضرت شاہ سکندرؒ پوری طرح نظر رکھتے تھے۔ اور آخر تک ان کی ترقی و تربیت میں کوشاں رہے۔ مندرجہ بیان کے خط کشیدہ الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے سلسلہ۔ قادریہ کا غلبہ اور گرفت حضرت امام ربانی پر کم ہو گئی تھی۔ لیکن تفویض خرقہ کے واقعہ کے بعد دونوں نسبتیں قادریہ اور نقشبندیہ کا آپ میں یکساں طور سے اثر و نفوذ قائم ہو گیا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ منزل سلوک کے بعض راہروؤں کو آپ ان کی طبیعت کی مناسبت اور رجحانات کے پیش نظر سلسلہ۔ قادریہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ کلاہ و شجرہ بھی اسی سلسلہ۔ کا دیا کرتے تھے۔ گویا سلسلہ۔ قادریہ کی طرف سے جو رکاوٹ آپ کی طبیعت میں پیدا ہو گئی تھی۔ تفویض خرقہ کے بعد اس میں پھر سے روانی آگئی۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

بحوالہ زبدۃ المقامات حضرت امام ربانی کی زبانی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ جب کیتھل میں حضرت شاہ سکندر رو س؂ کے آستانہ عالی پر مقیم ہوتے۔ تو یاران طریقت کا ایک وسیع حلقہ ہوتا تھا۔ جو ہر وقت بحر معرفت کے انوار میں غوطہ زن رہتا تھا۔ اور حضرت شاہ سکندر رو س؂ کے قلب منور کی شعاعیں ان کے دلوں کو منور کیے رکھتی تھیں۔ افسوس کہ کسی بھی تذکرہ سے مجھے ان بزرگوں کے (چند ایک کے سوا) سارے نام اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ جو اس دریا کے شناور اور اس بستان معرفت کے خوشہ چیں تھے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کہ حضرت شاہ سکندر رو س؂ جیسی عالی مرتبت شخصیت اور بلند رتبہ ہستی کے دامان تربیت سے فقط ایک امام ربانی جیسے ہی بزرگ نے تربیت پائی ہو۔ بلکہ یہ یقینی ہے کہ آپ کے ساتھ ایک حلقہ کثیر تھا۔ کہ جس نے یہاں سے حسب استعداد اپنا حصہ لیا۔ لیکن حضرت امام ربانی کا نام ان کے کارناموں کی وجہ سے باقی رہ گیا۔ باقی سب چراغ اس مشعل تاباں کے سامنے ماند پڑ گئے۔

زبدۃ المقامات کی یہ روایت سرسری نہیں۔ جیسا کہ حضرت شاہ سکندر؂ کے حالات میں مصنف نے لکھا ہے۔ " آپ کے بعد (یعنی حضرت شاہ کمال؂) حضرت شاہ سکندر؂ (نبیرہ حضرت اقدس) آپ کے مواریث احوال اور مواجید خوارق عادات کے وارث ہوئے۔ اور ایک مدت تک بہ جذبات و حالات عظیمہ اپنے آبائی سلسلہ سے فیض پہنچاتے رہے"۔ اب اگر " بہ جذبات و حالات عظیمہ " کا تجزیہ کیا جائے۔ تو ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ اور حضرت شاہ سکندر کا جو مقام ہمارے ذہن نے متعین کیا ہے۔ اس کی عظمت و رفعت زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی چلی جائے گی۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت شاہ سکندر؂ اس دور کے ان روایتی پیروں اور صوفیوں کی طرح کے صوفی نہ تھے۔ اور نہ ایسے پیر تھے۔ کہ جن کا ذکر حضرت امام ربانی نے بارہا اپنے مکتوبات میں نہایت رنج و قلق کے ساتھ کیا ہے۔ اور ان صوفیاء کے ہاتھوں دین و تصوف اور شریعت و طریقت کی جو گت بن رہی تھی ہر جگہ اس کا رونا رویا ہے۔ اگر یہاں بھی وہی عالم ہوتا جو عام طور

سے دعویداران تصوف کا تھا۔ تو صاف ظاہر ہے کہ امام ربانی جیسے غواص بحر طریقت و شریعت کا یہاں کیسے گذر ہوتا۔ یہاں کا رنگ تو زمانہ بھر سے الگ تہا۔ اور یہاں کی کیفیت دوسری تمام خانقاہوں سے مختلف تھی۔ وہ "جذبات و حالات عظیمہ" جن کے وارث حضرت شاہ سکندرؒ ہوئے تھے۔ ان کا تقاضا تو یہی تھا۔ کہ وقت کے دھارے کا مقابلہ کیا جائے۔ اور تاریخ کا رخ موڑنے کی سعی کی جائے۔ اور اپنے سایہ عاطفت میں ان لوگوں کی تربیت و پرورش کی جائے جو زمانہ کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹ جائیں۔ سوز دروں کی حدت سے خود بھی جلیں اور خس و خاشاک باطل کو بھی جلا کر خاک کر ڈالیں۔ حضرت شاہ کمالؒ کے بعد حضرت شاہ سکندرؒ نے چالیس سال گذارے۔ اور خدا جانے ان چالیس سالوں میں آپ نے کتنے دلوں کو اضطراب آشنا اور کتنی روحوں کو حقیقت آشنا کر دیا ہو گا۔ مومنانہ فراست کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ زمانہ کی نبض پر انگلی ہو۔ اور اس کے تمام نشیب و فراز سے مکمل طور سے آگاہی ہو۔ نہ وہ جوش و خروش ہو جو مصلحت کی حدود کو پھلانگ جائے۔ اور نہ وہ بے خبری ہو جو وقت کے حالات سے غافل کر دے۔ حضرت شاہ سکندرؒ کے دامان تربیت کے فیض یافتگان میں سرفہرست حضرت امام ربانی کا نام ہے۔ ابھی وہ میاں شیخ احمد ہی تھے کہ آپ کے در دولت سے وابستہ ہوئے۔ اور مجددیت کے مقام تک پہنچتے تک بھی یہیں سے منسلک رہے۔ ان کے رشد و ہدایت اور تبلیغ کا انداز اس امر کا غماض ہے۔ کہ ان کے اول مرشد و رہنما حضرت شاہ سکندر فضائل و کمال کا کتنا بڑا مظہر تھے۔ حضرت امام ربانی کے خطوط کا ہر فقرہ سحر نگاری کی معجز نمائیوں سے مزین ہے۔ فقرے نہیں تیر و نشتر ہیں کہ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ خطوط کا لفظ لفظ ایک ایسی نورانی مشعل ہے کہ جس کی روشنی کے سامنے باطل سرنگوں نظر آتا ہے۔

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاہ

نہ آپ میں وہ "مولویانہ" خشکی تھی۔ کہ لوگ سامنے آنے سے خوف کھائیں۔ اور نہ وہ "

صوفیانہ شعبدہ بازیاں تھیں۔ کہ تماشا گاہ عام بن جاییں۔ حضرت امام ربانی کی تمام زندگی میں جوش و ہوش، سکون و اضطراب کا جو امتزاج نظر آتا ہے۔ اس کی مثال شاید ہی کہیں نظر آ سکے۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

حضرت امام ربانی کی زبردست شخصیت اور بینظیر عبقریت نے جس طرح اس زمانہ کے ہر طبقہ کو متاثر کیا۔ اس کی مثال کہیں اور بمشکل ہی نظر آتی ہے۔ طبقہ۔ امرا۔ کہ جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی۔ بالخصوص آپ کے تیر نظر کا شکار تھا۔ اور آپ کی انقلابی کوششوں کے بار آور ہونے کا منجملہ اور اسباب کے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا۔ کہ آپ نے اس طبقہ کو اپنا مخاطب بنایا تھا۔ کہ جس کے بگڑنے سے معاشرہ بگڑتا ہے۔ اور جس کی درستی سے قوم کی زندگی میں حسن و رعنائی نظر آتی ہے۔ خان اعظم، خان جہاں، خانخانان، میرزا داراب، نواب سید فرید وغیرھم اکبر و جہانگیر کے دست راست اور ان کے درباروں کے نورتن۔ انہیں دماغی اعتبار سے متاثر کرنا اور ان کے خیالات کو اپنے تابع کر لینا گویا اوپر سے نیچے تک انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنا تھا۔ اور ان اراکین دولت سے آپ کے تعلقات کوئی ایک ہی دن میں پیدا نہیں ہو گئے تھے۔ بلکہ یہ تعلقات اکبر بادشاہ کے آخری ایام سلطنت ہی میں قائم ہو چکے تھے جو وقت کے ساتھ بڑھتے چلے گئے۔

جہانگیر کے تخت نشیں ہوتے ہی آپ نے جو خطوط مختلف امرائے دولت کے نام لکھے ہیں۔ وہ اس امر کے غماض ہیں کہ اس درویش خدامست نے کس طرح معاشرہ کے کار فرما طبقہ کو اپنی مٹھی میں لیا تھا۔ یہی نہیں۔ بلکہ بعض خطوط کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طبقہ کی ادنٰی سی لغزش کو بھی برداشت نہ کر پاتے۔ اور بے تکلف مخاطب کو اس کی نازیبا حرکت پر زجر و توبیخ کیا کرتے تھے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ امرائے دولت سے آپ کے یہ تعلقات جن میں صاف طور سے وہ رنگ پایا جاتا ہے۔ جو کہ ہادی و مرشد کے شایان شان ہے۔ حضرت شاہ سکندر ان

تعلقات سے بے خبر رہ سکتے تھے؟ حضرت شاہ سکندرؒ کے آستانہ ہدایت پر امام ربانی نے اپنی زندگی کا بہترین وقت گزارا تھا۔ ابتدائی تربیت کے مراحل آپ نے یہیں طے کیے تھے اور اولین قدم کی وہ شرط کہ جس کا نتیجہ ایک جنون بلاخیز کی صورت میں نکلتا ہے۔ آپ نے یہیں پوری کی تھی۔

؎ شرط اول قدم آنست کہ جنون باشی

کے مراحل سے آپ نے حضرت شاہ سکندرؒ کی بدولت یہ شناسائی پیدا کی تھی۔ اب غور فرمائیے کہ آپ کی وہ تمام سرگرمیاں جو دین کی درستی، تصوف و متصوفین کی اصلاح، معاشرہ کی نئے سرے سے تشکیل اور طبقہ امراء کے خیالات کو تبدیل کر دینے میں صرف ہوئی تھیں کیا اسے کبھی عقلِ سلیم تسلیم کرسکتی ہے۔ کہ ان میں اس قطب دوراں کی کار فرمائی شامل نہ تھی؟ حضرت شاہ سکندر کے متعلق امام ربانی کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے یہ معمہ خود بخود حل ہوتا چلا جاتا ہے کہ آپ کی تمام سرگرمیوں کا مرکز و محور وہی قلب منور تھا کہ جس کی روشنی نے ان راستوں کو روشن کیا تھا۔

کسی شاعر نے شاید اسی موقعہ کے لئے یہ شعر کہا تھا

این بادہ عشرت زایاغ کرم کیست؟   این پرتو احسان زِ چراغِ کرم کیست

خواجہ باقی باللہ سے انکی ملاقات بہت دیر سے ہوتی ہے۔ اور بلاشبہ ان سے ملاقات کے بعد حضرت امام ربانی کی طبیعت میں جولانی اور حدت و شدت فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں۔ کہ حضرت امام ربانی کی زندگی کا جو مقصد و مدعا تھا اور جس نہج و اسلوب پر وہ عمر بھر رواں دواں رہے۔ اس کی بنیاد حضرت شاہ کمالؒ نے رکھی۔ اور اس کی تعمیر و ترقی میں حضرت شاہ سکندرؒ نے بھر پور حصہ لیا۔ اور میاں شیخ احمد کو اپنی نگاہ کیمیا اثر کی تاثیر سے امام ربانی بنا دیا۔ اور مجددیت کے مقام پر پہنچا دیا۔ اور یہ بھی ایسے سوختہ جاں تھے۔ کہ جس چنگاری نے ان کے خرمن ہوش و حواس کو شعلہ ساماں بنا دیا۔ اور جس آستاں کی خاک نے انہیں

عرش آشنا کیا تھا۔ عمر بھر اس آستاں کی سجدہ ریزی میں مصروف رہے۔ اور آخر دم تک حضرت شاہ سکندر کی عنایات بے پایاں سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ "مایا نسبتِ فردیت" کا وہ مقام جس پر آخر کار یہ شہباز فضائے ولایت فائز ہوا انہیں کہاں سے ہاتھ آیا؟ اس کی نسبت انہی سے سنئیے۔ رسالہ "مبداء و معاد" میں تحریر فرماتے ہیں۔

ایں درویش را مایہ نسبت فردیت از پدر بزرگوار خود حاصل شدہ بود۔ و پدر بزرگوار آورا از عزیزے کہ جذبہ قوی داشتند بخوارق مشہور بودند بدست آمدہ بود"۔

ترجمہ اس درویش کو مایہ نسبت فردیت اپنے والد محترم سے حاصل ہوا تھا۔ اور انہیں ایک بزرگ سے حاصل ہوا تھا۔ جو جذبہ قوی رکھتے اور خوارق عادات میں مشہور تھے۔

زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ عزیز "کثیر الجذبہ والخوارق" سے حضرت شاہ کمال قادریؒ مراد ہیں۔

اب خیال فرمائیے کہ مایہ نسبت فردیت کو یوں تقسیم کرنے والے اور کثیر الجذبہ والخوارق کے مقام پر فائز بزرگ کس درجہ اور کس مرتبہ کے انسان تھے۔ حضرت شاہ سکندرؒ انہیں حضرت شاہ کمال قادریؒ کے جانشین اور سلسلہ۔ قادریہ میں حضرت امام ربانی کے ہادی و رہنما تھے۔ یہ وہی حضرت شاہ سکندرؒ ہیں۔ جن کے متعلق امام ربانی کی شہادت ہے کہ "ان کا قلب منور آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ اور آفتاب کی طرف دیکھنا تو ممکن ہے۔ لیکن غلبہ نور کی وجہ سے ان کے دل کی طرف نگاہ کرنا ممکن نہیں"۔ اس کے ساتھ ہی زبدۃ المقامات کی شہادت کہ "ایک عرصہ تک بحالات و جذبات عظیمہ خلق خدا کو فیض پہنچاتے رہے"۔ ہمارے دعویٰ کے ثبوت میں کافی ہیں۔ امام ربانی کی سیاسی، دینی اور معاشرتی سرگرمیوں پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ سلسلہ۔ قادریہ کے یہ دونوں بزرگ مجد و شرف کے کس بلند مقام پر فائز تھے۔ جن کے مکتبہ۔ فیض سے امام ربانی جیسے انسان تربیت پا کر نکلے ہوں۔ ان کی عظمت و جلال کے کیا کہنے۔ یہ دونوں وہ نیر تاباں تھے۔ کہ جن کی روشنی نے ایک عالم کی آنکھوں کو روشن کر دیا۔ اور یہ ایسے روشنی کے مینار تھے۔ کہ جن کی

سربلندی نے ابدالاباد تک کے لیے جہل کی ظلمتوں کو پست کر دیا۔ نور اللہ مرقدہما۔

حضرت امام ربانی نے اگرچہ اپنی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ لیکن آپ کے مکتوبات جو آپ نے مختلف اوقات میں ہندوستان کے ہر طبقہ کے لوگوں کے نام لکھے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ ان مکتوبات کی ہر سطر کان گہر اور معدن الذہب ہے ہزارہا تصانیف پر بھاری ہے۔ ان مکتوبات میں کوئی خط حضرت شاہ سکندرؒ کے نام نہیں لکھا گیا۔ مکتوبات امام ربانی کی یہ تہی دامانی بادی النظر میں کھٹکتی ہے۔ اور دل میں الجھن پیدا کرتی ہے۔ کہ وہ بزرگ ہستی کہ جس نے حضرت امام ربانی کی پرورش و تربیت اور ذہنی سانچہ کو ڈھالنے میں بھرپور حصہ لیا۔ اور ابتدائی زندگی ہی سے جس کے پر تو نے آپ کے قلب و نظر کو جلا بخشی۔ اس کو کہیں بھی خطاب نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کا جواب بھی سائل کو فوراً ہی مل جاتا ہے۔ مکتوبات امام ربانی کے انداز تحریر پر غور کیا جائے۔ تو ان کے انداز سے دو امور مترشح ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے ان لوگوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ کہ جنہیں کچھ سکھانا اور کسی راہ پر لگانا مقصود تھا۔ دوسرا گروہ اس ضمن میں آتا ہے۔ کہ جنہیں اپنے احوال سے شناسا کرنا اور اپنی کیفیات سے آگاہی دلانا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت شاہ سکندر روحؒ اور ان کا معاملہ ایک الگ کیفیت رکھتا ہے۔ یہی ایک آستانہ تھا کہ جس پر آپ نے عہد طفلی کی رنگینیاں اور زمانہ شباب کی رعنائیاں نچھاور کی تھیں۔ یہیں آپ کی زندگی کے بہترین ایام گذرے تھے۔ یہی وہ درسگاہ تھی۔ کہ جس کے سایہ میں آپ نے سرفرازی و شاہبازی کی تعلیم حاصل کی اس عتبہ عالیہ سے آپ کی عقیدت و محبت کا تقاضا یہی تھا۔ کہ زندگی کی ہر خوشی اور ہر راحت یہاں بے دریغ قربان کر دیتے۔

من چہ دریائے تو ریزم کہ سزائے تو بود

سر نہ چیزے ست کہ شائستہ پائے تو بود

لیکن وہ نیر درخشاں کہ جس کی روشنی نے ان کی آنکھوں کو ابتدائے زندگی ہی میں منور کر دیا تھا۔ اور یہ جس کی طرف بقول خود آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات بھی نہ کر سکتے تھے۔ کیا یہ اسے خطاب کر

سکتے تھے؟ یہ مقام غور کے قابل ہے۔ کہ جہاں یہ کیفیت ہو۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

وہ معمولات جو بے تکلف احباب میں برتے جاتے ہیں۔ یہاں کیسے برتے جاسکتے تھے۔ جس ہستی بزرگ کے احکام کی بجا آوری ہی سرمایہ سعادت دارین ہو اس کو خطوط میں مخاطب کرنا چہ معنی؟ اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت امام ربانی نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت چونکہ حضرت شاہ سکندرؒ کی صحبت اور قرب میں گزارا تھا۔ اور ویسے بھی سرہند کیتھل سے کچھ دور نہ تھا۔ جو امر پیش آتا تھا۔ وہ زبانی حاضر خدمت ہو کر دریافت کر لیا جاتا تھا۔ خطوط نویسی کے تکلفات تو وہاں ہوتے ہیں۔ جہاں ایک گونہ مغائرت ہو۔ لیکن جس ہادی و مرشد کی تعلیمات نے ابتداء ہی میں ان کیفیات سے دو چار کر دیا ہو۔ جو آخر عمر میں جا کر حاصل ہوتی ہیں۔ تو اس سے مراسلت اور مخاطبت کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ آپ کے مجموعہ مکتوبات میں کوئی خط حضرت شاہ سکندر روح محبوب الٰہی کے نام نہیں ملتا۔

خلفائے کرام:- جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا کہ حضرت شاہ سکندرؒ کے فیوض و برکات کا سلسلہ تو بہت وسیع تھا۔ لیکن آپ کے خلفاء میں سے جو شہرت و ناموری شیخ احمد سرہندیؒ کے حصہ میں آئی۔ وہ کسی اور کو حاصل نہ ہوئی۔ اور ان کی شہرت و عظمت کے سامنے دیگر خلفائے کرام کا چراغ نہ جل سکا۔ اور اس کا ایک سبب بھی ہے۔ کہ حضرت شاہ سکندرؒ کے سامنے ایک مہم تھی۔ جسے سر کرنا وہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتے تھے۔ اور اس مہم کے شرکائے کار وہی بزرگ ہو سکتے تھے۔ جو مبدء فیاض سے خاص قسم کا دل و دماغ لے کر آتے ہوں۔ اس دربار فضیلت میں ہر کسی کو بار نہیں مل سکتا تھا۔ یہاں وہی باریاب ہو سکتے تھے۔ جو بلا خیز طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی جرات رکھتے ہوں۔ روایتی پیر زادوں اور سجادہ نشینوں کی طرح حضرت شاہ سکندر محض

مریدوں کی تعداد بڑھانے پر نظر نہ رکھتے تھے۔ بلکہ انہیں ایسے جوہر قابل کی تلاش رہتی تھی۔ کہ جس کی بدولت وہ اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ حضرت امام ربانی کی تربیت اسی نہج پر کی تھی۔

حضرت امام ربانی کے بعد ایک اور بزرگ کا نام آپ کے خلفائے کرام میں نظر آتا ہے۔ یہ شیخ طاہر بندگی لاہوری ؒ ہیں۔ ان کے متعلق اکثر تذکروں میں مرقوم ہے کہ صاحب ریاضت و کرامات بزرگ تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں بھی مہارت تام رکھتے تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ اور علوم ظاہری میں کمال حاصل تھا۔ ان علوم کی تکمیل کے بعد سیر سلوک کا شوق پیدا ہوا۔ تو سرہند حضرت امام ربانی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ نے انہیں سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت فرمایا۔ اور اسی سلسلہ کے ریاضت و مجاہدہ کی طرف انہیں راغب کیا۔ گویا اس لحاظ سے سرہند میں ان کی حاضری اور مجدد صاحب سے بیعت ۱۰۱۲ھ کے لگ بھگ ہوئی کیونکہ خود حضرت امام ربانی نے خواجہ باقی باللہ ؒ سے ۱۰۰۸ھ میں بیعت کی تھی۔ اور شیخ طاہر بندگی کا سلسلہ نقشبندی میں ان سے بیعت ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ تعلق ۱۰۰۸ھ کے بعد قائم ہوا ہو گا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ سے بیعت کے بعد حضرت امام ربانی ۱۰۱۲ھ تک کہ یہ سال حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کا ہے۔ زیادہ تر دہلی ہی میں رہے۔ اور سلسلہ نقشبندیہ سے کسب فیوض کرتے رہے۔ شیخ طاہر صاحب کی ان کی خدمت میں حاضری اور سرہند میں مستقل قیام ۱۰۱۲ھ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت امام ربانی نے اسی وقت سے سرہند میں مستقل سکونت اختیار فرمائی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت امام ربانی کی خدمت میں رہ کر کتنے عرصہ میں وہ نعمت حاصل ہوئی ہوگی۔ کہ جس کی طلب و تمنا میں وہ یہاں حاضر ہوئے تھے۔ بہر حال جب وہ ان مراحل کو طے کر چکے۔ اور اس مقام پر پہنچ گئے۔ جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے۔ تو حضرت امام ربانی نے انہیں اپنے صاحبزادگان کی تعلیم و تربیت پر مامور فرما دیا۔ کہ یہ اس اہل تھے۔ صاحبزادگان کی تعلیم و تربیت آپ نے جس انداز میں فرمائی۔ اس پر تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔ کہ حضرت امام ربانی کا انتخاب بالکل صحیح تھا۔ اور ان کے اس جوہر کو

پہچاننے میں انہوں نے غلطی نہیں کی تھی۔ چنانچہ صاحبزادگان کی زبان سے روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ وہ شیخ طاہر بندگی کے ہمیشہ شکر گزار رہے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ "ہم کبھی بھی شیخ صاحب کے احسانات سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ جو انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ہم پر کیے۔"

تواضع، انکسار، مسکنت اور فروتنی ان کی طبیعت کی خصوصیات تھیں۔ یہاں تک کہ آستانہ مرشد پر جاروب کشی کی خدمت بھی اپنے ذمہ لے رکھی تھی اپنے پیر طریقت کا اس درجہ ادب ملحوظ نظر رکھتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ جب آپ کو امامت کے لیے آگے کیا گیا تو پاس ادب، خوف اور رعب مرشد کے سبب قرات آپ کے گلے میں اٹک اٹک جاتی تھی۔ اور اسی عالم میں آپ نے بمشکل تمام نماز ادا کی۔ تمام علوم مروجہ میں کامل و اکمل ہونے کے باوجود اتنی فروتنی آپ ہی کا حصہ تھی۔ اور اسی خصوصیت نے آپ کو دیگر حلقہ مریداں سے ممیز کر رکھا تھا۔ جب سلسلہ نقشبندیہ کے تمام احوال و مقامات تک ان کی رسائی ہو چکی۔ تو اک اور عروج کی طرف ان کے مقدر نے رہنمائی کی۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ ایک بار حضرت شاہ سکندرؒ سرہند تشریف لے گئے آپ کا وہاں قدم رنجہ فرمانا ایسا ہی تھا۔ جیسے کسی گلستان میں باد بہاری نے قدم رکھا ہو۔ خدا جانے حسنات و برکات کے کتنے پھول مہک اٹھے ہوں گے۔ اور اس سرزمین پر کس درجہ کی بارش انوار ہوئی ہو گی۔ نہ صرف یہ کہ حضرت امام ربانی آپ کے دوران قیام میں ہمہ وقت کمر بستہ رہے۔ بلکہ وہاں کا تمام حلقہ متبعین و معتقدین بھی آمادہ خدمت رہا۔ جب آپ وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ تو حضرت مجدد کے ساتھ ان کے تمام محب و مرید بھی باادب استادہ تھے۔ سب سے مصافحہ اور معانقہ کے بعد آپ نے تبسم زیر لب کے ساتھ حضرت امام ربانی سے فرمایا۔ کہ ہمیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے۔ جو علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تام رکھتا ہو۔ چند روز تک ہمارے پاس قیام کر سکے۔ اور قصیدہ بردہ کو صحیح طریق سے نقل کر دے۔ اس خطاب کے دوران آپ بار بار شیخ طاہر بندگی کی طرف نگاہ بھی ڈالتے جاتے تھے۔ اس خطاب اور انداز نگہ سے امام ربانی نے، پہچان

لیا۔ کہ حضور والا کیا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بعد ادب عرض کیا۔ کہ "حضور! ہمارے حلقہ میں شیخ طاہر بندگی سے بہتر اس مقصد کے لئے اور کوئی شخص حاضر نہیں ہے۔ یہی ہین جو آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر اس خدمت کو سرانجام دے سکتے ہیں"۔

چنانچہ یہیں سے شیخ صاحب کے اصل عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اور وہ پیمانہ۔ کیف و سرور جو ابھی تک تشنگی سے دوچار تھا۔ اس کی سیرابی کا سامان ہونے لگتا ہے۔ یہ بھی محرمِ اسرار خلوتیانِ راز میں سے تھے۔ فخرو مباہات کے ساتھ آپ کے ہمراہ عازم کیتھل ہوئے۔ حضرت شاہ سکندر خدم و حشم کے ساتھ سواریوں پر تھے۔ لیکن یہ اپنی خلقی فروتنی کے باعث پا پیادہ ہی ہمراہ رہے۔ اور کسی سواری پر سوار نہ ہوتے۔ اس مسکین طبع درویش کو اہل نظر دیکھتے ہوں گے۔ اور زبان حال سے پکارتے ہوں گے

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر　　　　تو چہ دانی کہ دریں گروہ سوارے باشد

منزل بمنزل جب حضرت شاہ سکندر رؤئس کیتھل پہنچے۔ تو کچھ عرصہ تک آپ نے شیخ طاہر بندگی کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ ان کے لئے یہ بے توجہی شدت اضطراب کا باعث ہوئی۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا۔ ان کی بے قراری بڑھتی جاتی تھی۔ نہ جانے کی اجازت تھی۔ اور نہ حضرت شاہ سکندر کی مجلس اقدس میں بار ملتا تھا۔ نہ جائے ماندن نہ جائے رفتن۔ بغیر اجازت چلے جانا داخل گستاخی تھا۔ لیکن قیام اس سے بھی زیادہ مشکل۔ یہ جو امیدیں دل میں لے کر آئے تھے۔ اور جن انوار کی تجلیات کے حصول کی تمنا دل میں لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ ایسے عالم میں سالکانِ راہ سلوک پر جو گزرتی ہے۔ اسے کچھ وہی جانتے ہین۔ جو اس منزل سے گزرے اور اس راہ پر چلے ہیں۔

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم　　　　اے بے خبر ز لذت شربِ مدام ما

آخر جب انکی بے قراری واضطراب اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ تب انہوں نے چند ایک اشعار لکھ کر حضرت والا کی خدمت اقدس میں پیش کیے۔ جن میں اپنے دردِ دل کا اظہار کیا تھا۔ افسوس کہ وہ اشعار ضائع ہو گئے۔ اور مجھے کہیں نہ مل سکے۔ شرائف غوثیہ میں صرف ان کا تذکرہ درج ہے۔ یقیناً وہ اشعار نہایت فصیح و بلیغ ہوں گے۔ جن میں ایک سوختہ جاں نے اپنے خرمن ہستی کے لئے برق خرمن کی طلب کی تھی۔ اور اس سودائے خام کے لئے دست تمنا بڑھایا تھا۔ جس کا انجام ہمیشہ سے بے سروسامانی ہوتا ہے۔ زمانہ کی قدر ناشناسی اور وقت کی ستم ظریفی نے کیسے کیسے لعل گراں بہا ضائع کر دیے۔ کہ جن کی شعاعیں اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی دیدہ دِل کو روشن کیے رکھتی ہیں۔ شیخ طاہر بندگی کی یہ منظوم التجا بھی اس ضمن میں آتی ہے۔۔ بہر حال جب یہ اشعار حضرت والا کے ملاحظہ میں آئے۔ اور آپ نے شیخ طاہر بندگی کی بے قراری معلوم کی۔ تو انہیں قصیدہ بردہ لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ شیخ طاہر بندگی نے تعمیل ارشاد کی۔ اور چند دنوں میں قصیدہ بردہ صاف او خوشخط لکھ کر حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت تک شیخ طاہر بندگی کا حضرت والا سے کوئی عملی تعلق قائم نہ ہوا تھا۔ انہیں اتنا ہی معلوم تھا۔ کہ ہمارے شیخ طریقت کے پیر اور خانوادہ غوثیہ کے چشم و چراغ ہیں۔ عادات واطوار۔ اور دیگر حالات سے انہیں مطلقاً واقفیت نہ تھی۔ قصیدہ بردہ کا پہلا شعر حضرت والا نے پڑھا۔ تو شیخ طاہر بندگی کو غایت درجہ حیرت ہوئی۔ کہ وہ نحویوں کے قاعدہ کے خلاف تھا۔ مگر پاس ادب سے خاموش رہے۔ دوسری مرتبہ پھر حضرت والا نے اس شعر کو غلط طریق سے پڑھا۔ تو ان سے نہ رہا گیا۔ اور باادب عرض کیا کہ حضور! یہ شعر یوں پڑھنا چاہیے۔ شیخ طاہر شعر پڑھ رہے تھے اور اُدھر وہ سرچشمہ کمال جوش میں آرہا تھا۔ آپ نے ایک نظر ان کی طرف نگاہ کرم سے دیکھا۔ اور فرمایا " اے شیخ طاہر! جس طرح ہم پڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح صحیح ہے" یہ فقرہ فرماتے وقت طبیعت پر جلال غالب تھا۔ اس جلال کے پرتو کا عکس شیخ طاہر بندگی پر پڑتا تھا۔ کہ وہ فوراً بے ہوش ہو گئے۔ اس ایک نگاہ غلط انداز میں صاعقہِ طور کی سی کیفیت تھی۔ کہ جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیگانہ ہوش و خرد کر دیا تھا۔ حضرت شاہ سکندر کی یہ نگاہ کرم کچھ

ایسی پر تاثیر تھی۔ کہ جس وقت شیخ طاہر پر پڑی۔ یہ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اور روایت ہے کہ تین دن تک اسی عالم میں رہے۔ تیسرے دن جب اس بادہ سرجوش کا نشہ کم ہوا۔ تو حضرت والا نے اپنی خدمت میں انہیں طلب کیا۔ اور احوال پرسی کی۔ یہ اپنا احوال کیا بیان کرتے۔ یہ تو اس شعر کے مصداق تھے۔

گر حال پوچھتے ہو تو خود عرض حال ہے
درویش ہوں فقیر ہوں صورت سوال ہے

جس پیمانہ کیف و سرور کی لذت یہ تین دن میں چکھ چکے تھے۔ اب اسے اپنے ہونٹوں سے جدا کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ بصد ادب سلسلہ قادریہ میں بیعت کے لئے درخواست کی۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ اور آپ نے انہیں بیعت کیا۔ اور کلاہ و خرقہ عنایت کیا۔ ان پر حضرت شاہ سکندرؒ کا وہ رعب وجلال کہ جس نے انہیں پہلے دن ہی بیگانہ ہوش و خرد کر دیا تھا۔ کچھ اس طرح طاری تھا۔ کہ کیتھل میں جب تک ان کا قیام رہا۔ یہ آپ کے سامنے آنے سے گریزاں رہے۔ اور اسی عالم میں ایک دن سرہند جانے کی اجازت طلب کی۔ اجازت مل گئی۔ اور یہ جانب سرہند روانہ ہو گئے۔ اثنائے سفر میں ایک جگہ رات بسر کی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو کیتھل کا وہی حجرہ تھا۔ کہ جہاں یہ قیام کیا کرتے تھے۔ سمجھ گئے کہ رخصت کی اجازت لینے میں جلدی کی ہے۔ اس لئے کچھ دن اور ٹھہرے رہے۔ جب حضرت شاہ سکندر رحؒ کو پوری طرح اطمینان ہو گیا۔ کہ وہ امانت جس کے یہ اہل تھے۔ انہیں پہنچ گئی ہے۔ تو لاہور جانے کی ہدایت فرمائی۔ یہ کیتھل سے چل کر سرہند پہنچے۔ حضرت امام ربانی سے ساری کیفیت بیان کی۔ وہاں سے بھی انہیں لاہور جانے کی رخصت ملی۔ ان کے دم اور سعی و کوشش سے شمالی پنجاب میں سلسلہ قادریہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ ۱) کلانور۔ ۲) بٹالہ۔ جالندھر شمالی پنجاب کے قصبات اور کشمیر وغیرہ ان کے فیوض و برکات سے مرجع خاص وعام بنے۔ اور بے شمار لوگوں نے راہ ہدایت پائی۔

حضرت شیخ طاہر بندگی کی ذات باوجودیکہ آخری عمر میں مرجع خلائق تھی اور ان کا آستانہ ایک دنیا کے لئے مرکز ہدایت تھا۔ لیکن وہ فروتنی جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھی عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ اتنے بڑے مقام پر مامور ہونے کے باوجود بھی عجز و انکساری نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ حضرت شیخ کا اس درجہ ادب کرتے کہ ان کی مجلس میں جب کوئی حضرت شاہ سکندر کا نام لیتا۔ تو کیتھل کی طرف رخ کر کے بے ساختہ ماتھے پر ہاتھ رکھ لیتے۔ گویا سلام کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ شاہ سکندرؒ وارد لاہور ہوئے۔ جہاں آپ نے قیام فرمایا وہاں ایک مجمع کثیر ہر وقت آپ کی خدمت میں رہتا تھا۔ یہ بھی حاضرین مجلس کے ساتھ خدمت اقدس میں حاضر رہتے۔ لیکن ہمیشہ پائین مجلس میں بیٹھتے۔ بلکہ

---

۱) حضرت شیخ محمد افضل کلانوریؒ پنجاب کے بہت ہی نامور بزرگ ہوئے ہیں۔ جو حضرت ابو محمد قادری لاہوری کے مرید خاص اور خلیفہ تھے۔ حضرت ابو محمد قادری لاہوری کو حضرت محمد طاہر بندگی قادری لاہوری سے خلافت حاصل ہوئی تھی۔ شیخ محمد افضل کلانوریؒ نے سلسلہ قادریہ کمالیہ سکندریہ کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور شمالی پنجاب میں اس سلسلہ کی ترویج فی الواقع آپ کی محنت و تبلیغ کا کارنامہ ہے۔ آپ کے دامن فیض سے ایک ایسی بستی وابستہ ہو گئی تھی۔ جس پر فیضان قادریہ کی وجہ سے عشق الہی کا جذبہ غالب تھا۔ اور جو فیضان قادریہ کی موجودگی میں کسی دیگر نسبت کی طرف اپنے قلب و روح کو متوجہ نہ کر سکتی تھی۔ اور جسے سرکار بغداد حضور غوث پاک کی غلامی پر فخر تھا۔

۲) اس ہستی کی آغاز منازل سلوک میں حضرت شاہ کمال قادری اور حضرت شاہ سکندر روسؒ نے بہت امداد فرمائی تھی۔ حضرت شیخ ابو محمد قادری اور حضرت شیخ محمد طاہر بندگی لاہوری نے جو فیوض و برکات اس شخصیت تک پہنچائے وہ بھی تاریخ میں درج ہیں۔ یہ شخصیت حضرت ابو الفرح شاہ محمد فاضل الدینؒ بٹالوی کی تھی۔ جو پنجاب کے علماء اور فضلاء میں ایک مقام رکھتے تھے۔ اور ان کی زیر سرپرستی ظاہری اور باطنی علوم کی تکمیل میں مشغول ہو گئے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا شمار کاملین فقراء میں ہونے لگا۔ حضرت شیخ محمد افضل کلانوری اپنے اکثر مریدوں کو بغرض تکمیل تربیت باطنی آپ کے سپرد فرما دیا کرتے تھے بٹالہ میں آپ کے مرشد نے لنگر خانہ جاری کیا ہوا تھا جو انہوں نے آپ کے نام سے منسوب کر دیا۔ آپ نے سلسلہ قادریہ کی ترویج کے لئے ایک عظیم الشان درگاہ قائم کی جو آج بھی قائم ہے۔ آپ نے ذی الحج ھ بٹالہ میں وصال فرمایا اور وہیں پر آپ کی تدفین ہوئی۔ آپ صاحب جذب و صاحب کرامت بزرگ تھے۔ اور اولیاء اللہ میں آپ کا رفیع مقام تھا۔ آپ علوم مروجہ میں عالم بے مثل تھے۔ فارسی' عربی' اردو اور پنجابی میں بہت عمدہ شعر بھی کہتے تھے۔ آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ کے نام سے چالیس اور بروایت دیگر یکصد تصنیفات منسوب ہیں۔ ایک مرتبہ انہیں حضرت شاہ سکندر محبوب الہیؒ نے عالم رویا میں بشارت دی اور فرمایا کہ فاضل الدین تمہاری خانقاہ ہمیشہ مرجع خلائق رہے گی اور ایک عصا عطا فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں روپیہ یومیہ آپ کی خانقاہ میں خرچ ہوتا تھا۔

روایت میں ہے کہ بیٹھتے بھی نہ تھے۔ اکثر باادب استادہ رہتے۔ قیام لاہور کے دوران ایک مرتبہ حضرت شاہ سکندر تفریح کے لئے باہر نکلے۔ اور اتفاق سے ادھر آپ کا گذر ہوا۔ جہاں شیخ طاہر بندگی کی قیام گاہ تھی۔ اس وقت یہ مکان کی چھت پر کھڑے تھے۔ جب حضرت شاہ سکندرؒ کے جمال جہاں آرا پر ان کی نظر پڑی تو بے قرار ہو گئے۔ اور اسی عالم بے قراری میں چاہا کہ چھت پر سے نیچے چھلانگ لگا دیں۔ انہیں یہ بھی گستاخی نظر آتی تھی۔ کہ جناب مرشد نیچے ہوں اور یہ اوپر کھڑے رہیں۔ ان کے اس اضطراب اور بیقراری کو دیکھ کر حضرت شاہ سکندر نے اشارہ فرمایا۔ تب یہ سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ اور قدمبوس ہوئے۔ ۱۰۴۰ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار لاہور میں مرجع خلائق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربت کو عنبریں کرے۔ ان کے نام حضرت شاہ سکندر روس کا لکھا ہوا ایک خط بھی ہے۔ جو نقل کیا جاتا ہے۔ مکتوب اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن ہر لفظ سے وہ شفقت و عنایت ہویدا ہے۔ جو حضرت شاہ سکندر روس انپر روا رکھتے تھے۔

نقل خط

برادر دینی محمد طاہر طال اللہ شرفہ۔

رباعی:- اندر طلبِ شوق چو مردانہ شدم   اول قدم از وجود بیگانہ شدم

او غم چو نمی شنید لب بر بستم   او عقل نمی خرید دیوانہ شدم

اگرچہ ہیبتِ صورت از دیدۂ بصیرت دور است لیکن ہمہ اوقات عیون فواد از مشاہدہ خیال محفوظ و مسرور است۔ رباعی

در راہِ یگانگی نہ کفر است نہ دیں   یک گام ز خود برون نہ وراہ بہیں

اے جان جہاں تو راہ اسلام گزیں   با مار سیہ نشیں با خود نشیں

اللہ بس۔ ماقی ہوس تا از خودی رستی تحقیق بحق پیوستی۔ حاجی الحرمین شیخ داؤد محب مخلص اگر پرسان حال باشند از ما دعا خواہند و بر ظہر کتاب تعویذ بواسیر خونی نوشتہ است۔

دیگر خلفائے کرام:- قدیم تذکروں میں حضرت شاہ سکندر رحؒ کے خلفاء میں چند ایک اور نام بھی مذکور ہیں۔ لیکن ان کے حالات کہیں درج نہیں ہیں۔ مجبوراً ان کے اسمائے گرامی لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شیخ حبیب اللہ سرہندی:- ان کے متعلق اتنا معلوم ہے کہ صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ نظم ونثر ادب کی دونوں اصناف پر قادر تھے۔

"گلزار خوارق" کے نام سے انہوں نے ایک تذکرہ حضرت شاہ کمالؒ پر مشتمل مرتب کیا تھا۔ جسے ۱۰۲۲ھ میں انہوں نے مکمل کر کے حضرت شاہ سکندر کی خدمت میں پیش کیا اور سندِ خوشنویسی حاصل کی۔ اس سے زائد ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ان کے چند ایک چیدہ چیدہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت بدر الدین سرہندی کے عزیزوں میں سے تھے۔

منقبت حضرت شاہ کمال لعل دیالؒ

قطب الاقطاب سید الاوتاد — غوث الاحرار اشرف الامجاد

ہادی راہ حق بدرویشاں — شاہ دیں بدرویشاں

جذبہ اش دلربائے مجذوباں — وجہ او جاں فزائے مطلوباں

حرم روضہ اش حریم بہشت — خاک و خاشاک او عنبر سرشت

خاکسار درت حبیب اللہ — می ندارد بجز در تو پناہ۔

منقبت حضرت شاہ سکندر رحؒ محبوب الٰہیؒ۔

واقف از منتہائے درویشی — جذب او سرزماں بے خویشی

رہنمائے شریعتِ نبویؐ — متصف باصفات مصطفویؐ

باش خاموش اے حبیب اللہ — نتواں گفت مدح شاہ اللہ

جاوداں باد ہم چو گل تازہ — سال عمرش فزوں ز اندازہ

یہ ہے نمونہ ان کے کلام کا۔ اشعار مختلف نوعیت کے ہیں۔ حمد۔ نعت۔ قصیدہ منقبت۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے طوالت کے خوف سے انہیں چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

فہرست خلفاء حضرت شاہ سکندر محبوب الٰہی

شیخ بہلول دہلوی رحمتہ اللہ علیہ	سید حامون لاہوریؒ
ملا امام لاہوری رحمتہ اللہ علیہ	شاہ محمود علم لاہوریؒ
سید علی خواص سرحدی رحمتہ اللہ علیہ	شیخ ادریس ساماٹویؒ
شیخ محمد گجراتی رحمتہ اللہ علیہ	سید حسن شاہ ولی اللہ لاہوریؒ
سید ولی اللہ لاہوری رحمتہ اللہ علیہ	ملا حسین جامی لاہوریؒ
شیخ نور محمد چشتی رحمتہ اللہ علیہ	میراں شاہ غازی رام گڑھیؒ

ان کے علاوہ دیگر خلفائے حضرت شاہ کمالؒ و حضرت شاہ سکندرؒ کے صرف نام مجھے مل سکے ہیں۔ جن کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ان کے حالات زندگی مجھے کہیں نہیں ملے۔

شیخ احمد سلام بہاری شیخ عین الدین۔ شیخ محمد اسحاق۔ قاضی عبدالرحمن دیپالپوری۔ سید محمد مدرس سندھی ابو الفتح ساماٹوی۔ شیخ مودود۔ حضرت شاہ قمیص۔ محمد خاں تاشقندی۔ شیخ عثمان سہارنپوری۔ سید امان اللہ حسینی۔ شیخ محمد اسماعیل از اولاد شیخ جلال الدین تھانیسری۔ شیخ بلال سندھی۔ سید علی مشہدی۔ قاضی محی الدین کلانوری۔ ملا اسماعیل ملتانی۔ شیخ علی آفندی۔ شیخ لطیف خوارزمی۔ سید محمد مکی شیخ اللہ داد رہتاسی۔ شیخ سالم برہانپوری۔ سید غیاث الدین لاہوری شیخ عبدالرزاق چہلی تھانیسری۔ قطب عالم دہلوی۔ بابا بسم اللہ بدایونی۔ (باوا گوپال داس)

کرامات۔ وفات۔ جانشین

کرامات اگرچہ کسی بزرگ کے لئے سرمایہ فخر و مباہات نہیں۔ اور حضرت شاہ سکندر محبوب الٰہی

تو جس مقام پر فائز تھے۔ اور جو کارنامہ آپ نے سرانجام دیا۔ یعنی اس مکتبہ فکر کا اجراء اور تاسیس کہ جس کے انوار سے آج تک سرزمین ہندوستان پاکستان منور ہے۔ اس کارنامہ عظیم کے مقابلہ میں ہر کرامت ہیچ اور کمتر ہے۔ لیکن اولیاء اللہ کی حیات طیبہ دیگر عوام کی زندگیوں سے چونکہ الگ ہوتی ہے۔ اور اپنے اندر ایک خاص انفرادیت رکھتی ہے۔ اس لئے ان سے ایسے امور کا سرزد ہوجانا کچھ بڑی بات نہیں کہ دوسرے جن سے عاجز ہوں۔ آپ کے جد محترم اعلیٰ حضرت شاہ کمالؒ خوارق عادات میں مشہور تھے اور ان سے بیساختہ کرامتوں کا ظہور ہوتا تھا۔ اور ان کی طبیعت میں جذب و جلال بھی زیادہ تھا۔ لیکن ان کے مزاج میں سکون و تحمل کا عنصر زیادہ غالب تھا اور شاید زمانہ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اعلیٰ حضرتؒ کے مقابلہ میں ان کی طبیعت میں زیادہ ٹھہراؤ اور سکون و ثبات ہو۔ وہ بانی تھے اس سلسلہ کے جو بعد میں سلسلۃ الذہب ثابت ہوا۔ اور یہ اسے تعمیر کرنے والے تھے۔ معمار کے لئے۔ بہرحال زیادہ سے زیادہ ہوش مندی اور تدبر و حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔۔ بہرحال ذکر تھا آپ کی کرامتوں اور خوارق عادات کا۔ یہ بیان درمیان میں ضمناً آگیا۔ مشہور ہے کہ آپ کی نگاہ مین وہ تاثیر تھی۔ کہ جس پر نگاہ ڈالتے تھے۔ چاہے وہ کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو۔ آپ کا حلقہ بگوش بن جاتا تھا۔

یعنی شبنم از فیض نگاہ او گہر

جب آپ لاہور تشریف لے گئے اور وہاں پر آپ کی عظمت و بزرگی کا شہرہ ہوا۔ تو ایک عالم دین ملا عبدالرحمن نامی ایسے بھی تھے جو ان باتوں کے شدت سے منکر بلکہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ شیخ طاہر بندگی چونکہ بندگان درگاہ میں سے تھے۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ حضرت والا کا تصادم ملا عبدالرحمن سے ہو۔ اس لئے جب بھی کبھی حضرت والا باہر نکلتے تو جناب شیخ انہیں اس راستے سے کبھی باہر نہ لے جاتے جہاں ملا عبدالرحمن تشنگان علم کو اپنے چشمہ فیض سے سیراب کیا کرتے تھے۔ لیکن شیخ طاہر بندگی کی تمام کوششیں ایک مرتبہ سراسر ناکام ہوگئیں۔ اور حضرت والا اسی راہ پر چل نکلے کہ جدھر ملا عبدالرحمن کی فروگاہ تھی۔ پاس ادب سے جناب طاہر بندگی کچھ کہ تو نہ سکے۔

لیکن کسی خلاف مزاج واقعہ کے رو نما ہونے سے بے حد خوفزدہ تھے۔ اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے۔ کہ یہ وقت خیریت سے گذر جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب حضرت والا ملا صاحب کی فرودگاہ کے سامنے پہنچے اور ان پر آپ کی نگاہ پڑی۔ تو وہ بے سروپا دوڑے اور سلام مسنون اور مصافحہ و معانقہ کے بعد دم بخود ساتھ چل پڑے۔ شیخ طاہر بندگی کو یا تو یہ توقع تھی۔ کہ ملا عبدالرحمن آپ کو دیکھتے ہی جھگڑا کریں گے۔ اور امتحان و آزمائش کے راستوں پر چلیں گے۔ لیکن یہاں یہ عالم ہوا۔ کہ اولین نگاہ نے تمام قصہ پاک کر دیا۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

اور جناب ملا اپنے تمام علم و فضل کی بزرگی کو بالائے طاق رکھ حلقہ مریدی میں شامل ہو گئے۔

اور اس مقام پر فائز ہوئے جو بندگان عشق و فنا کا حصہ ہے۔ سچ ہے

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

فقر و درویشی کے کوچہ میں قدم نہ رکھتے تو فقط ملاّ رہتے۔ اور قال اقوال کے تیر و تفنگ سے میدان جہاد گرم رکھتے لیکن یہاں پہنچے تو ایک نئی لذت سے آشنا ہوئے۔ کہ جس کے سامنے تمام متاع دینوی، ہیچ و خرافات ہے۔

صحبت روشن دلاں یکدم دودم
آں دودم سرمایۂ بودو عدم

عشق راشوریدہ ترکرد وگذشت
عقل را صاحب نظر کردو وگذشت

بعین ہی یہی واقعہ کیتھل میں شیخ طاہر بندگی کے ساتھ پیش آیا۔ گو ایک مدت سے وہ حضرت امام ربانیؒ کے حلقہ تربیت و ہدایات میں شامل تھے۔ لیکن مولویت کے وہ اثرات ان پر غالب تھے۔

کہ جن کے زیر اثر وہ جوہر پوشیدہ رہتا ہے۔ جس کی تابانی نگاہ انسان کو وہ مقام عطا کرتی ہے۔ کہ جس کے سامنے عرش و کرسی کی بلندیاں بھی کم تر نظر آتی ہیں۔ اور جس کے بغیر انسانی کردار میں پختگی و پائیداری پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور یہی وہ خمستان کیف و سرور ہے کہ جس کا ذائقہ چکھ لینے کے بعد وہ نشہ طاری ہو جاتا ہے کہ جسے تخویف و تحریص کی کوئی ترشی دور نہیں کر سکتی۔

بانشہ درویشی درسازو دمادم زن

چوں پختہ شوی خودرابر سلطنت جم زن

یہی سرگشتگان بادہ انا الحق تھے۔ جنہوں نے شاہی درباروں کی عظمت کو روند ڈالا۔ اور یہی وہ جاندادہ حسن لم یزلی تھے۔ کہ جنہوں نے تخت کے دبدبہ کو الٹ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی تربتوں کو عنبریں کرے۔ کہ انہیں نفوس قدسی کے دم سے مشام جان عالم معطر ہے۔ ہاں تو بات چل رہی تھی۔ حضرت شاہ سکندر کی کرامتوں کی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے روحانی شفا بخشی کا ملکہ تو عطا فرمایا ہی تھا۔ جسمانی بیماریاں بھی آپ کے دست مبارک کے لمس سے دور ہو جاتی تھیں۔ روایت ہے کہ آپ کے دست حق پرست میں ایسی زبردست تاثیر تھی۔ کہ جس مریض کے جسم سے چھو جاتا تھا۔ مرض یکسر اس سے دور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ کی اس شفا بخشی کا شہرہ سن کر دور دور سے لوگ آستانہ عالیہ پر حاضر ہوتے تھے اور شفائے جسمانی و روحانی سے اپنا دامن مراد بھر کر لے جاتے تھے۔ وہ پیچیدہ امراض جن کی کہنہ تک اطباء نہ پہنچ سکتے تھے آپ کے ہاتھ پھیرنے سے وہ یوں دور ہو جاتے تھے کہ گویا کبھی لاحق ہی نہ ہوتے تھے بعض مریضوں کو آپ درگاہ میں جو کنواں تھا اس کا پانی پینے کی ہدایت فرماتے۔ اور بعض کو کسی درخت کے پتے چبانے کا مشورہ دیتے اور ان ہدایات پر عمل کرنے سے لوگ شفایاب ہو جاتے تھے۔ اب تک بھی یہ عالم تھا کہ بعض زندگی سے مایوس مریض خانقاہ کے احاطہ میں قیام کرتے اور صرف کنوئیں کا پانی پیتے اور کھرنی کے وہ درخت جو قدیم سے درگاہ کے احاطہ میں کھڑے تھے۔ ان کے پتے چبالیا کرتے تو اللہ تعالیٰ انہیں شفا کاملہ عطا فرما دیتے تھے۔

آپ کی ایک کرامت اور مشہور تھی۔ وہ یہ کہ جس کے اولاد نرینہ نہ ہوتی تھی۔ اسے آپ ایک تعویذ عنایت فرمایا کرتے تھے جسے گلے میں ڈالنے کے بعد اللہ تعالیٰ اولاد نرینہ کی طرف سے مایوس لوگوں کا دامن مراد بھر دیا کرتے تھے۔ آپ کا قلمی تعویذ مصنف کے پاس موجود ہے۔ تعویذ کا اصل تو یہ ہے کہ فقط بہانہ ہوتا تھا۔ ورنہ آپ کی نگاہ میں وہ تاثیر تھی کہ درخت کی خشک ٹہنی پر پڑتی تو وہ سرسبز ہو جاتی تھی۔ اور زبان مبارک سے جو لفظ نکلتا تھا۔ فرمان قضا کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ آپ کی دعا سے پیدا ہونے والوں میں حاجی نور سکندر۔ عبد الکمال اور دایہ انگہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حاشیہ ا:۔ حضرت حاجی نور سکندر:۔ آپ کا پورا نام نور سکندر تھا۔ آپ:۔ شاہجہان بادشاہ کے عہد میں لاہور کے نہایت عابد و زاہد اور پرہیز گار دولتمند تجی بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے شاہ جہاں کو کسی مہم میں خطیر رقم دی تھی۔ سات حج کیے۔ ۱۰۷۰ ھ میں وصال فرمایا۔ میانی صاحب میں دفن ہیں۔ مزید حالات "مدینۃ الاولیاء" میں سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

۲۔ حضرت عبد الکمال:۔

آپ کا نام اسی نسبت سے عبد الکمال ہے۔ ان کے والد کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوتی تھی۔ آپ اپنے وقت کے ولی کامل تھے۔ مزار دریائے راوی کے کنارے لاہور میں واقع ہے۔ ان کے مزید حالات "مدینۃ الاولیاء" مصنفہ محمد دین کلیم صفحہ ۵۳۶ میں مل سکتے ہیں۔

۳۔ دایہ انگہ:۔ آپ کا اصل نام زیب النساء تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں اس کا بڑا عروج تھا۔ دایہ انگہ جہانگیر کے دولت خانہ میں رہتی تھی۔ اس کے شوہر کا نام مراد خاں تھا۔ اس نے شاہ جہاں کی پرورش اپنے دودھ پر کی تھی۔ دایہ انگہ بہت ہی پارسا اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ ۱۰۸۲ میں فوت ہوئی۔ لاہور میں مقبرہ دائی انگہ کے نام سے مشہور ہے۔

مختلف تذکروں میں آپ کی ایک اور کرامت مذکور ہے۔ وہ یوں کہ ایک مرتبہ جب آپ لاہور میں قیام فرما تھے۔ تو کچھ سامان کیتھل بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس مقصد کے لئے چند خچر مہیا کیے گئے۔ خچروں پر جب وہ سامان بار کر دیا گیا۔ تو ان کے ساتھ جانے کے لئے محافظ تجویز ہونے لگے۔ جب آپ نے سنا تو منع فرما دیا۔ اور فرمایا کہ خچر خود یہ سامان کیتھل پہنچا دیں گے۔ ان کے ساتھ کسی محافظ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ پاس ادب سے کسی کو یارائے سوال نہ ہوا۔ اور خچر بلا کسی محافظ و نگراں جانب کیتھل روانہ ہو گئے۔ خچروں کو جب لوگوں نے راہ پر لگا دیا۔ تو آپ نے ان خچروں کی طرف مخاطب ہو کر اتنا ضرور فرمایا کہ " یہ سامان کیتھل پہنچانا ہے۔ ذرا احتیاط سے لے جانا" لاہور سے کیتھل تک کا فاصلہ اڑھائی سو میل سے کم نہیں۔ راہ میں صحرا۔ جنگل اور دریا راستے کی سبھی مشکلات آئیں۔ چور اور راہزن بھی ملے۔ لیکن نہ ان خچروں کو پکڑنے کی کسی کو جرات ہوئی۔ اور نہ وہ سامان اتارنے کی ہمت ہوئی۔ خچر بعافیت تمام کیتھل پہنچ گئے۔ آپ نے وہ رقم اپنے رفقاء کو عنایت فرمائی جن کی بیٹیاں بالغ تھیں اور شادی کے قابل تھیں۔ اس رقم سے کئی ہزار لڑکیاں بیاہی گئیں۔

قناعت و سادگی کا پیکر ہونے کے علاوہ آپ کا یہ خصوصی وصف تھا۔ کہ شاہی دربار میں جانے اور ارکان سلطنت سے خصوصی تعلقات قائم کرنے کی آپ نے کبھی ضرورت نہ سمجھی۔ اعلیٰ حضرت کا تعمیر کردہ حجرہ آپ کی خصوصی نشستگاہ تھی۔

جس نے آنا ہوتا تھا وہیں آتا تھا اور اس چشمہ فیض سے اپنی پیاس بجھاتا تھا۔ آپ کے خلفاء اور مریدین آپ کے ایما اور ہدایات پر اکثر دلی اور آگرہ کے سفر کیا کرتے تھے لیکن آپ کے وقار و متانت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کبھی کیتھل شریف سے باہر جانے کی کبھی چنداں ضرورت نہ سمجھی صرف ایک لاہور کے سفر کا تذکرہ قدیم ملفوظات میں موجود ہے۔ ورنہ اس کے علاوہ آپ نے کبھی کوئی سفر نہیں کیا۔ اول ہی دن سے جو وضع اختیار فرمائی تھی آخری دم تک اسی پر قائم رہے یہ بھی آپ کی کرامات تھی کہ شاہی درباروں کا طمطراق امراء و وزراء اور ارکان و دولت سے ملاقات کی

لذت کوئی چیز آپ کو اپنے وضع سے نہ ہٹا سکی۔ قدرت نے جو صلاحیتیں آپ کو ودیعت فرمائی تھیں ان کا صحیح استعمال یہی تھا کہ آپ اپنی وضع پر قائم رہتے۔ اور طالبان حقیقت اور تشنہ گان طریقت کی رہنمائی فرماتے اور آپ نے یہی کیا شاہی درباروں کی رنگینیوں اور رعنائیوں نے جن حضرات کو متاثر کیا اور وہ بزرگ جو اس طرف لپکے ان کا انجام کیسا عبرتناک ہوا۔

امراء دربار خصوصاً دربار اکبری کے امراء کا جو انداز فکر تھا وہ کسی بھی صاحب صلاحیت اور شناسائے حقیقت بزرگ کے لئے پسندیدہ نہ تھا۔ اکبری دور کے آخری ایام میں تو یہ عالم تھا کہ بادشاہ کے ہر قول و فعل پر آمنا وصدقنا کہنا ضروری تھا۔ تمام امرائے دربار بلا استثناء اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ان لوگوں سے میل ملاقات رکھنا اپنا وقت ضائع کرنا تھا۔ آخر حضرت امام ربانیؒ نے بھی ابتدائی زمانہ میں یہی تجربہ کیا اور یہی تجربہ کتنا تلخ رہا ابوالفضل اور فیضی سے ملنے جب آپ آگرہ گئے تو آپ کی علمیت تلی اور دیگر اعلیٰ صلاحیتوں نے ان دونوں تاریخ ساز برادران کو بے حد متاثر کیا اور حضرت امام ربانی کی ان دونوں بھائیوں نے نہایت صدق دل سے پذیرائی کی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نہ کہ چند ہی دنوں میں حضرت امام ربانی پر واضح ہوگیا کہ یہ لوگ علم فروش ہیں اور ان سے ملاقات رکھنا یا میل جول بڑھانا تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں چنانچہ دارالسلطنت کا یہ رنگ دیکھ کر آپ کو اپنے گوشہ عافیت کی جانب ہی رجوع کرنا پڑا۔ پر جوش طبائع کا قاعدہ ہے کہ جب تک کہ وہ خود کوئی تجربہ نہ کریں انہیں قرار نہیں آتا ضرور ہے کہ آگرہ کا یہ سفر کرنے سے پہلے انہوں نے حضرت شاہ سکندرؒ سے مشورہ کیا ہوگا اور حقیقت حال سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود بھی آنجناب نے انہیں اجازت دیدی ہو تاکہ یہ بچشم خود دیکھ لیں کہ یہ گلستانِ پر بہار کہ جس کی رعنائیاں اور دلفریبیاں بظاہر جنت الفردوس کی برابری کا دعوے کرتی ہیں۔ اس میں قدم قدم پر کیسے نوکیلے اور زہریلے کانٹے چھپے ہیں جو اس راہ کے راہروؤں کے پاتوں کو چھلنی کیا کرتے ہیں۔۔ بہرحال دوسرے اصحاب نے جو کچھ تجربہ کے بعد جانا اسے آپ نے اپنی فراست دینی اور روشن ضمیری کی بنا پر بغیر تجربہ کیئے جان لیا اور ہر اس آفت سے محفوظ و مامون رہے کہ جو اس

راہ پر چلنے والوں کو پیش آیا کرتی ہیں۔ روایت ہے کہ اکثر احباب نے آپ کو دارالسلطنت کے سفر کی ترغیب بھی دی۔ اور بعض امرائے دربار کی جانب سے یہ تحریک بھی ہوتی۔ بالخصوص راجہ ٹوڈر مل اور عبدالرحیم خانخانہ کو جو اعلیٰ حضرت کے مقام و مرتبہ کے شناسا اور اس شاہباز فضاء طریقت کی بلند پروازوں سے آگاہ تھے انہوں نے بہت چاہا کہ آپ دربار شاہی میں حاضر ہوں اور ان فوائد سے بہرہ ور ہوں جو شاہی درباروں میں حاضری کا ثمر ہوتے ہیں لیکن یہاں زبان حال سے یہی ایک جواب تھا۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

چنانچہ احباب کی کوئی بھی سعی اس سلسلہ میں کارگر نہ ہوئی اور آپ آخر دم تک اپنی اسی وضع پر قائم رہے جو ابتداء میں آپ نے اختیار کر لی تھی۔ بے نیازی اور آزادہ روی جو بندگان احرار کا طرہ امتیاز ہے تمام عمر آپ کی کلاہ فقر کا نشان رہی۔ نکتہ دان حقیقت اقبال نے اس کیفیت کی تشریح چند اشعار میں کس خوبی سے کی ہے

مرد حر اللہ الصمد دل بستہ
از حدِ اسباب بیروں جستہ

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردشِ دولاب نیست

مسلم استی بے نیاز از غیر شو
اہلِ عالم را سراپا خیر شو

چوں علیؓ درساز بانان شعیر
گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر

فقر و فاقہ:- تنگی و ترشی اس راہ کے چلنے والوں کے مقدر میں یہی کچھ لکھا ہوتا ہے لیکن آج لوحِ عالم پر ان میں سے کتنوں کے نام درج ہیں؟ جو یہاں عیش و عشرت کے گہواروں میں پلے۔ جنہوں نے ایوان و قصور میں اپنی زندگیاں گزاریں ریشم و کمخواب جن کا ملبوس تھا۔ اور ہیرے اور موتی جن پر نچھاور ہوتے تھے؟ اگر ایوان قضا و قدرت میں کسی کا کام ہدایت کے نور سے مزین ہے تو وہ یہی بوریہ نشین درویش تھے۔ کہ جن کے دامن دل کو دنیا کی کوئی دلکشی نہ کھینچ سکی اور جو کبھی دلفریبیِ عالم سے متاثر نہ ہوئے کوئی تحریص و ترغیب انہیں اپنے مسلک سے ہٹا نہ سکی عمر بھر میں صرف ایک ہی سرمایہ اکٹھا کیا جس کا نام نفس مطمئنہ ہے پھر یہی تھے جنہیں بارگاہِ خالق کون و مکاں سے یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ المرضیۃ کی نوید ملی۔ اور یہی وہ خوش نصیب بندگان خدا تھے جو سو وہ عند ربہ مرضیا سے بہرہ ور ہوئے۔ انہیں کے دم سے دنیا میں سعادت کا نور پھیلا۔ اور جن ازلی اور ابدی حقیقتوں کو زمانہ کا غبار اپنے دامن میں چھپا لیتا ہے ان کی بدولت وہ آشکار ہوئیں۔ یہی تھے جن کے سامنے شرار بولہبی کی شعلہ سامانیاں سرد پڑ جاتی اور فرعونیت کی قہرمانیاں خاموش ہو جاتی تھیں۔ یہ محافظ تھے چراغ مصطفوی کے اور پاسبان تھے شریعتِ محمدی کے انسانیت کا جتنا بھی نور یہاں نظر آتا ہے وہ انہی کا مرہون منت ہے

چمن را ترو تازہ آراستند

چو شبنم نشستند برخاستند

حضرت شاہ سکندرؒ طبعاً سلاطین اور امراء سے گریز کرتے تھے۔ صرف اخلاقاً ان سے ملتے تھے۔ ایک دفعہ حاکم سامانہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ قرب الٰہی کیسے حاصل ہوتا ہے؟ تو آپ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا آپ ہم فقیروں سے خدا کی پناہ طلب کرتے ہیں اور ہم (فقراء) اہل دنیا سے حق تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں

حضرت شیخ احمد سرہندی شادی کے بعد سخت بیمار ہو گئے مایوسی کی حالت میں آپ کے والد نے ایک قاصد کے ذریعے آپ سے دعا کی درخواست کی آپ نے دوگانہ ادا کرنے کے بعد فرمایا گھبرانے کی بات نہیں شیخ احمد جلد صحتیاب ہو جائیں گے ان کے وجود سے دین مبین کو بڑا فروغ حاصل ہو گا۔

چمن را ترو تازہ آراستند
چوں شبنم نشستند برخاستند

زبدۃ المقامات :- سے روایت ہے کہ ایک روز امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نے مجذوبوں کا ذکر کرتے ہوتے فرمایا کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ والد ماجد لاہور تشریف لے گئے میں بھی اس سفر میں ان کے ہمراہ تھا۔ ایک روز رزق اللہ شاہ مجذوب سے ملنے کے لئے ہم ان کے پاس گئے۔ ان کی رمز کی باتیں سنیں میں نے ان سے اپنے مرشد کے احوال سننے کے لئے کہا ہی تھا کہ رزق اللہ شاہ نے سنایا کہ ایک روز نائب مناب آں ذوالکمال حضرت شاہ سکندر قدس سرہ کی مجلس لگی ہوئی تھی۔

نائب مناب آن ذوالکمال اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں کچھ بیان کر رہے تھے۔ مجلس گرم تھی۔ فرمایا اللہ کا ذکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور دل سے بھی۔ اور وہ ہر جگہ محیط ہے ایک درویش نے اس کی وضاحت چاہی۔ وفعتہً وہ رفع حاجت کیلئے اٹھا اور جنگل کو چلا گیا جس جگہ وہ دیکھتا اسم ذات لکھا ہوا پاتا۔ جابجا اس کو اسم ذات کندہ نظر آیا۔ درویش پریشان تھا کہ وہ رفع حاجت کے لئے کہاں جائے۔ جس پتھر کو اٹھاتا اللہ لکھا ہوا پاتا۔ حضرت شاہ سکندر قدس سرہ اس کے اس مشاہدہ اسم ذات کو دیکھ رہے تھے۔ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ایک درویش نے اس کا سبب دریافت کیا۔ تو آپ نے اس کا ذکر کیا اور فرمایا اسے رفع حاجت کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی اور وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر پھرتا تھا۔ آپ نے با آواز بلند اس درویش کا نام لے کر کچھ

کہا۔ اللہ کل شئی محیط کی حقیقت اس پر کھل گئی اور اس نے اپنی مشکل سے نجات پائی۔ یہ واقعہ سنا کر مجذوب اٹھ کر چلا گیا۔

آپ کی شہرت سن کر ایک ہندو جوگی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا کہ کوئی کرامت دکھائیں۔ آپ نے فرمایا ہم ارادۃً ایسا نہیں کرتے ہمارا کام کرامت دکھانا نہیں بلکہ اللہ کی عبادت اور بندگی ہے اس پر جوگی اپنے استدراج کے زور پر نظروں سے غائب ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد ظاہر ہو گیا اس نے یہ کھیل کئی بار کیا۔ آپ نے اس سے پوچھا تجھے یہ سب کچھ کیسے حاصل ہوا؟ اس نے کہا کہ میں نے تمام عمر نفس کے خلاف کام کیا۔ آپ نے سوال کیا کہ کبھی اسلام کے متعلق بھی سوچا۔؟ اس نے جواب دیا نہیں آپ نے فرمایا پھر مناسب یہی ہے کہ اپنے نفس کے خلاف زبان سے کلمہ۔ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو جانا چاہیے۔ جوگی نے یہ بات قبول نہیں کی اور مزید شعبدہ بازی کا مظاہرہ کیا۔ جب وہ اپنے کرتب دکھا چکا تو اس نے کہا کہ اب آپ بھی کچھ دکھائیں۔ آپ نے فرمایا ایک مرتبہ پھر وہی کچھ دکھا سکتے ہو جو اس سے پہلے دکھا چکے ہو اس نے۔ بہت کوشش کی مگر وہ کوئی شعبدہ نہ دکھا سکا یہاں تک کہ عاجز آ کر اس نے اپنی شکست تسلیم کی اور اسلام قبول کیا۔

کرامت الاولیاء سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ سرہند تشریف لے گئے سخت گرمیوں کا موسم تھا آپ اس وقت مجدد صاحب کے گھر پہنچے جبکہ سورج نصف النہار پر تھا۔ حضرت مجدد قیلولہ کے لئے زنان خانہ جا چکے تھے اطلاع ملتے ہی باہر آتے اور کچھ اس انداز سے پذیرائی کو آگے بڑھے جو انہی عظیم المرتبت بزرگوں کا حصہ ہے خادم کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے مرشد کے پاؤں دھوئے سپاس گزاری یہ تھی کہ آپ نے دھوپ میں قدم رنجہ فرمایا ہے حضرت شاہ سکندر محبوب الٰہی بھی مجدد صاحب کی بڑی قدر و منزلت فرماتے تھے۔ ایک روز آپ نے فرمایا اگر چاہتے ہو العلماء ورثۃ الانبیاء۔ کے معنی معلوم ہوں تو میاں شیخ احمد کو دیکھ لو

قاضی صدر الدین لاہوری پر حضرت غوث الاعظم کی محبت غالب تھی۔ اور ہر روز آپ کی روح مبارک کو ایصال ثواب پہنچایا کرتے تھے ایک شب حضرت غوث الاعظم کو خواب میں دیکھا۔ انہوں

نے فرمایا صدر الدین کیتھل میں ہمارے فرزند شاہ سکندرؒ کے پاس جاؤ ان کی زبان ہماری زبان ہے۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور بیٹھتے ہی اس نے عرض کیا کہ میں کثیر العیال ہوں۔ تنگدستی سے گذر ہوتی ہے لڑکیاں جوان ہیں اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں گردش ایام کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں آپ مجھے کوئی کیمیاء کا نسخہ عطا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ فقیر اللہ اللہ کرتا ہے۔ تم بھی کیا کرو۔ یہی کیمیاء ہے۔ آپ کی نظر مٹی کے برتنوں پر پڑی وہ سونے کے ہو گئے اس نے ان طلائی برتنوں کو اٹھانا چاہا وہ فوراً مٹی کے بن گئے اس نے کہا یہی میری قسمت کا حال ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چار آنے لے اور اس سے کپڑے کا کاروبار کر خود بھی کھا اوروں کو بھی کھلا تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ کپڑے کا بہت بڑا تاجر بن گیا۔

سامانہ میں شرف الدین ایک مجذوب سالک رہا کرتے تھے حالت سلوک میں ان کو جذب ہو گیا۔ جن دنوں آپ سامانہ تشریف لائے ایک دن شور و غل ہوا کہ شرف الدین لوگوں کو پتھر مار رہا ہے۔ اور لوگوں کو تنگ کر رہے ہیں۔ اور بچے ان کو چھیڑتے ہیں آپ ان کے پاس چل کر گئے انہوں نے آپ کو آتے ہوئے دیکھا تو پتھر اپنے ہاتھ سے گرا دیے اور قدم بوس ہوتے آپ نے اس کو مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا۔ اور غلبہ۔ توحید کی بشارت دی۔ اس کے بعد وہ سلوک میں لوٹ آئے۔

عشق اول عشق آخر کل
عشق شاخ و عشق نخل و عشق کل

وفات

آخر وہ وقت بھی آن پہنچا جو ہر ذی روح کے لئے مقدر ہے۔ قدرت ان سے وہ کام لے چکی تھی جس کے لئے انہیں اس تیرہ خاکدان عالم میں بھیجا گیا تھا۔ متوسلین درگاہ۔ خلفائے کرام اور مرید اقصائے ہند میں پھیل چکے تھے۔ اور وہ دو فتنے جو اس وقت کے ہندوستان پر حاوی تھے۔ یعنی تشیع اور اکبری الحاد ان دونوں کے قلع قمع میں مصروف تھے۔ آپ کی علالت نہایت مختصر تھی۔

۱۰۲۵ھ میں ماہ جمادی الاول کی دس تاریخ تھی۔ اور شنبہ کی صبح جبکہ آپ نے تمام حاضرین درگاہ معلی کو اپنے پاس بلالیا۔ دنیا میں فجر کا وقت تھا اور نیر تاباں اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔ لیکن یہ آفتاب ہدایت جس نے سالہا سال تک ہندوستان کے دینی افق اور سلسلہ قادریہ کی دنیا کو منور کیا تھا غروب ہو رہا تھا۔ سب کے دل آنے والے وقت کے خوف سے مضطرب تھے۔ اور ہر شخص آپ کی جدائی کے خیال سے گریاں وبریاں تھا۔ درد کی ایک بے پایاں لہر اٹھی۔ جسکی ٹیس نے سب کو بے چین کر رکھا تھا لیکن اگر کوئی مطمئن تھا تو وہ آپ ہی تھے روایت ہے کہ جب آپ نے اپنی رحلت کا احوال اور وقت احباب سے بیان کیا تو جس نے سنا بے اختیار رو دیا۔ ایسے وقت میں جبکہ حیات آمادہ سفر ہے حضرت شاہ سکندر قدس محبوب الٰہی کی ذات والاصفات ہی تھی۔ جو سب کو تسکین دے رہی تھی۔

نشان مرد مومن باتو گویم

چو مرگ آید تبسم برلب اوست

حاضرین کی جزع فزع پر آپ بار بار اس آیت شریفہ کو زبان پر لاتے تھے جس میں قاعدہ کلیہ اور ابدی حقیقت بیان کی گئی ہے جو ناقابل تردید ہے۔

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال

متوسلین درگاہ خلفاء کرام اور صاحبزادگان تمام بوقت رحلت آپکی بالین پر موجود تھے۔ آپ نے ہر ایک کو اس کے احوال کے مطابق پند و نصائح سے سرفراز فرمایا۔ دونوں صاحبزادگان جناب شاہ گدائے رحمان عباس اور جناب محب اللہ الیاس زہدی کی جانب بطور خاص مخاطب ہوئے۔ اور فرمایا

فرزندان من! تمہارے جد محترم حضرت شاہ کمال قادریؒ نے یہاں جس کار عظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ الحمدللہ اس ناچیز کی حقیر سی کوششوں کی بدولت وہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس راہ میں بے شمار مشکلات پیش آئیں۔ اور بے حد و حساب رکاوٹوں نے سنگ راہ بن کر راستہ روکا۔ لیکن

الحمد اللہ ہمارے عمل میں کوئی کمی نہ آئی۔۔ بہت سے وسوسے تھے جنہوں نے دل کی دنیا کو تہہ وبالا کرنے کی سعی کی۔ اور شیاطین کا ایک بڑا گروہ تھا۔ جو ہر لمحہ رہزنی پر آمادہ رہا۔ لیکن وہ نورِ ازل کہ جس نے ہمارے نہاں خانۂ دل کو منور کیا تھا اسکی روشنی سر ظلمات پر غالب آئی اب جبکہ حق نمودار ہو چکا ہے اور باطل نے پسپائی اختیار کر لی ہے۔ ان باتوں کا دوہرانا بے کار ہے تم دونوں کو میری ایک ہی وصیت ہے کہ دنیوی جاہ وحشم اور مال ومنال کی تمنا نہ کرنا یہ شیطان کا فریب ہے جو اس میں ایک بار پھنس گیا اس کا نکلنا محال ہو گیا۔ مقام عزیمت کا قرب و حصول ان ہی بندگان خدا کو میسر آتا ہے جو سراپا اخلاص وایثار ہوتے ہیں جو لوگ درویشی کے دعوے کرتے اور حرص وہوا کے کوچہ میں قدم رکھتے ہیں۔ انہیں سوائے سرگردانی اور پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سلسلہ قادریہ کی روایات بڑی تابناک ہیں اس سلسلہ کے اکابرین نے دین فروشی کے ذریعے کبھی دنیا حاصل نہیں کی حق گوئی ان کا شعار رہا اور فقروفاقہ کے عالم میں سرفراز رہے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا چاہے کیسی ہی ضرورت پیش آتے زبان ودل پر کسی برائی کی پرچھائیں نہ پڑے زمانہ نازک ہے اور راستہ دشوار۔ اللہ تعالی تمہارا محافظ ونگران ہو قرآن وسنت کی روشنی میں ہی زندگی بسر کرنا فلاحِ دارین کا باعث ہے تمہارے جد اعلی سیدنا عبدالقادرؒ جیلانی کا یہی شعار تھا۔ اور عمل کے اس اخلاص ہی نے انہیں امامت پر متمکن کیا تھا

الحمد اللہ میں نے تمام عمر اس مسلک پر چلنے کی کوشش کی ہے اور تمہارے لئے یہی راستہ چھوڑے جارہا ہوں مجھے ابھی سے اس مقام کی جھلک نظر آرہی ہے جہاں دن رات انوار الہیہ کا انعکاس ہوتا ہے جہاں مرشد اولین وآخرین سرکار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔ جمیع صحابہ کرام۔ حسنین پاک رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس روحیں میری منتظر ہیں اسی مقام پر امام الاولیا۔ شیخ الجن والانس سیدنا عبدالقادرؒ جیلانی اور جد محترم کبیر الاولیا۔ ملک العشاق حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ میرا انتظار فرمارہے ہیں

وما علینا اِلاّ البلاغ

صاحبزادگان کی طرف سے توجہ ہٹا کر آپ امام ربانیؒ کی طرف متوجہ ہوئے جو اس وقت صورت تصویر خاموش کھڑے تھے دل میں درد و اضطراب کا ایک طوفان برپا تھا لیکن تسلیم و رضا نے زبان و لب پر مہرِ خاموشی ثبت کی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے وہ بساط الٹی جا رہی تھی اور وہ محفل درہم برہم ہو رہی تھی جس میں انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت گزارا تھا وہ قائد و رہنما ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے روپوش ہو رہا ہے جسکی رفاقت میں پورے چالیس سال گزرے تھے لیکن ضبط کا یہ عالم ہے کہ لب آہِ سرد سے بھی شناسا نہیں ہو سکتے اھل اللہ کا یہی تو وہ شیوہ ہے جو انہیں دیگر اہل اسلام سے ممتاز و ممیز رکھتا ہے۔

حضرت شاہ سکندرؒ نے جب ان سے خطاب کیا تو بے اختیار ہو گئے۔ آپ کے دست مبارک کو آنکھوں سے لگایا۔ جہاں دجلہ و فرات کی طغیانیاں بہہ نکلنے کو بے تاب تھیں اور سر طغیانی صرف اس ایک اشارہ کی منتظر تھی وہ امام ربانی اور مجدد الف ثانی جسکی استقامت نے پہاڑوں کی سنگینی اور دریاؤں کے طوفانوں کو دعوت مقابلہ دی۔ آج ایک طفل نوخیز کی طرح بے تاب ہو گیا۔ آنکھوں سے گنگا جمنا کی دھارا بہہ نکلی مرشد والا تبار کا وہ ہاتھ جو آنکھوں سے لگا رکھا تھا اچانک دستِ شفقت بن کر ان کے سر پر پہنچ گیا جب ان کے جذبات کا طوفان رکا تو آپ نے فرمایا "میاں احمد اب تم اس مقام پر پہنچ چکے ہو جہاں ہم تمھیں دیکھنا چاہتے تھے اور وہ سرمایہ حیات تم حاصل کر چکے ہو جو ہر متاع دین و دنیا سے افضل ہے اب امتحان کا وقت آنے والا ہے۔ آزمائش و استبلاء کا دور شروع ہونے والا ہے۔ دیکھنا کہیں تمہارا قدم نہ پھسل جائے۔ اس مقام عظمت کی حفاظت اگر جان دے کر بھی کرنی پڑے۔ تو دریغ نہ کرنا۔ اگر امتحان میں ثابت قدم رہے تو انشاء اللہ نمرودانِ وقت کی بھڑکائی ہوئی آگ تمہارے لئے گلزار ابراہیمؑ بن جائیگی۔ اور جو کہیں تمہارے قدم میں لغزش آ گئی تو اسفل السافلین سے ادھر ٹھکانہ نہ ہو گا۔"

جب وقت رحلت قریب آیا۔ تو آپؒ نے حاضرین میں سے ایک خوش الحان قاری کو تلاوت کلام پاک کا حکم دیا۔ قاری نے تلاوت شروع کی۔ اور سورۃ رحمٰن کے سحر حلال نے تمام فضا کو

مسحور کر دیا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ قرآن پاک کی ہیبت و جلال کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ ابھی قاری اس آیت شریفہ تک پہنچا ہی تھا کل من علیھا فان ○ ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ○ فبای آلاء ربکما تکذبن ○ کہ آپؒ نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○ ایک عظیم سانحہ تھا۔ جس نے یہ خبر سنی دم بخود رہ گیا۔ آپؒ کی کریم النفسی، شفقت بے پایاں اور لطف و کرم کا ذائقہ جنہوں نے چکھا تھا۔ ان کیلئے تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ سب کو یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ دل و دماغ دونوں جواب دے گئے ہیں۔

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست

تانہ پنداری کہ تنہا می روی

صاحبزادگان اور حضرت امام ربانیؒ نے مل کر آپؒ کو غسل دیا۔ جنازہ میں خلقت کا وہ ہجوم تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ جن و ملائک تک نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئے ہیں دیار و امصار سے لوگ آ رہے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ تین مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ نماز جنازہ کیلئے حضرت امام ربانیؒ سے استدعا کی گئی۔ لیکن غلبۂ اندوہ اور فرطِ ادب کے باعث آپؒ نے اس خدمت سے انکار کر دیا۔ سید امان اللہ حسینیؒ کے حصہ میں یہ سعادت آئی۔ شام کا وقت تھا۔ جب اس آفتاب علم و عمل کو آغوش لحد کے سپرد کیا گیا۔ آپؒ کی قبر اسی احاطہ میں تیار کی گئی۔ جس احاطہ میں اعلحضرتؒ شاہ کمالؒ کا مزار مبارک تھا۔ یہ احاطہ بڑا وسیع ہے۔ چھ سات ایکڑ زمین سے کم نہ ہو گی۔ جو پختہ چار دیواری سے محدود ہے۔ اعلحضرت کے مزار کے جانب جنوب مشرق کوئی ڈیڑھ سو قدم کے فاصلہ پر آپ آسودہ خواب ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپؒ کی قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ دو ڈیڑھ گز اونچا چبوترہ ہے۔ جس پر گنبد تیار کیا گیا تھا۔ روایت ہے کہ آپؒ کا اصل مدفن ایک سرداب میں ہے۔ جسکا دروازہ ایک حجرہ میں نکلتا تھا۔ اور جسے تیغہ کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں مزارات پر جا کر انسان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے۔ الفاظ میں تو اسکا نقشہ کھینچنا ممکن نہیں۔ 1925ء یا 1930ء تھا کہ ایک اہل دل بزرگ وسطی پنجاب سے کیتھل تشریف لائے۔ اسٹیشن پر قدم رکھتے

ہی فرمانے لگے۔ "مجھے کیتھل کی فضا انوار قادریہ سے بھرپور نظر آتی ہے۔" ان بزرگ کا یہ فرمان کچھ مبالغہ آرائی پر مبنی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اگر ذرا بھی کسی کے دل میں اس آتشِ سوزاں کی چنگاری ہے جسکی روشنی راہرو راہِ سلوک کی نگاہوں کا سرمہ بنتی ہے۔ تو اسے ان دونوں مقبروں کے اندر اور باہر وہ کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ کہ اس پر ہزار ہا بادہ شبینہ کی سرمستیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

اور ایسا کیوں نہ ہو؟ یہاں وہ بزرگ ہستیاں محوِ خوابِ عدم ہیں کہ جنہوں نے اپنی تمام زندگی اور زندگی کی ہر راحت اک مقصدِ عظیم کیلئے قربان کر دی تھی۔

حاصلِ عمر نثار رہِ یارے کردم

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

دنیا مقامِ فنا ہے۔ یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے۔ دوام فقط ایک ذات خداوندی کو حاصل ہے لیکن اگر کسی نے اپنی زندگی یہاں رہ کر بلند مقاصد کے حصول میں صرف کی۔ تو پھر اس کے سر پر رحمت خداوندی نے ہمیشہ بقائے دوام کا تاج رکھا اور اسے قیامت تک کیلئے حیات جاوید کا خلعت عطا فرما دیا۔

یہ قابلِ احترام ہستیاں جنکا تذکرہ اس کتاب میں ہے۔ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں انؒ کا احترام باقی ہے۔ اور انؒ کا نام زبانوں پر موجود ہے۔ سبب وہی ہے۔ کہ یہ عمر بھر اس دنیا اور اس کی الائشوں سے پاک رہے۔ اور حیاتِ جاوداں کے مستحق و سزاوار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی قبروں کو عنبریں فرمائیں۔ کہ ان کا وجود کاروانِ حیات کیلئے مشعل نور سے کم نہیں۔ اگر یہ مال و دولت سمیٹنے اور زر و جواہر اکٹھا کرنے میں لگ جاتے۔ تو شاید کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین ٥

بمصداق ضرب المثل کہ ہر درخت اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ آپؒ کے رفیع الدرجات خلفاء اور اولاد ہی آپؒ کی عظیم شخصیت اور علو مرتبت کی شہادت ہے۔ ایک انگریز

مورخ مسٹر اے۔ ایم مسو نے اپنی کتاب "ڈسٹرکٹ کرنال" میں آپؒ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اور آپؒ کی اولاد کو عزت و شرافت کی عظیم الشان یاد گار مانا ہے۔ آپؒ کے خاندان کے افراد ہر زمانے مین خلق خدا کیلئے مرجع ہدایت بنے رہے ہیں۔ اور آپؒ کا گھرانہ عقیدت مندوں اور ارادتمندوں کی محبت اور امیدوں کا مرکز رہا ہے۔

جانشین

حضرت شاہ سکندر روس الاولیاء محبوب الہیؒ کے دو صاحبزاد گان میں گداء رحمن عباسؒ اور محب اللہ الیاس زہدیؒ میں سے آپؒ کی خلافت حضرت شاہ محب اللہؒ کے حصہ میں آئی۔ جنہوں نے آخیر دم تک اس بار امانت کی حفاظت کی۔ اور سلسلہ عالیہ قادریہ کے انوار و تجلیات کی شمع کو روشن کئے رکھا۔ ھ میں انتقال فرمایا۔ آپؒ ایک علیحدہ احاطہ میں دفن ہیں جو حضرت شاہ سکندر روس محبوب الہیؒ کے مزار کے جانب مغرب اور بہت سے اولیاء اللہ کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے ہیں۔

حضرت خواجہ محمد معصومؒ آپؒ کا بے حد احترام کرتے تھے۔

مکتوبات معصومیہ دفتر اول کے دو مکتوبات 27 و 74 کے ایک ایک لفظ سے حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کی آپؒ سے عقیدت و محبت ظاہر ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرتؒ اور حضرت شاہ سکندر روس محبوب الہیؒ کے وابستگان کو شاہان مغلیہ اور دیگر راجگان، روسا اور نوابین کی طرف سے دی گئی جاگیرات سے متعلق شاہی فرامین و اسناد کی نقول جو تاریخ پر کام کرنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گئی بحمد اللہ وہ مصنف کے پاس محفوظ ہیں۔

() تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے تذکرہ شاہ سکندر" مطبوعہ میری لائبریری اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو دو صاحبزادہ حضرت سید غلام رسول شاہ خلف الصدق حضرت سید محمد علی شاہ گیلانی

رحمۃ اللہ علیہ اولاد امجاد ابو البرکات کبیر ملک العشاق حضرت سید شاہ کمال قادری کیتھلی

و قطب الاقطاب حضرت سید شاہ عبد اللہ سکندر روش محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہم

خاندان مانڈلان نوشہرہ والی کی پیر مرشد قدیمی ہیں یعنی خاندان مانڈلان قدیم

اس خاندان عالیشان حضرات غوثیہ کمالیہ و سکندریہ کی منوز مرید با ارادت و خادم

با نسبت چلی آتی ہیں۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب موصوف غریب نواز و نوابان کرنال

و برادران شہر سامانہ کی پاس اینجانب بمقام حیدر آباد دکن تشریف لائی۔ بعد ادائی

[illegible] بستعدی ہم ترخیص [illegible] آیا لہذا یہ سند بنا بر ارادت [illegible] تحریر ہو کر حوالہ

صاحبزادہ صاحب موصوف کی گئی تحریر ۲ شعبان المکرم ۱۳۵۳ ہجری روز پنجشنبہ

فضل علی خان [illegible]

[illegible] حیدرآباد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]